جاوید احمد غامدی

# الاسلام

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

الاسلام

جاوید احمد غامدی

# الاسلام

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

ناشر: المورد

طابع: فائن پرنٹرز، لاہور

طبع ہفتم : اپریل 2017ء

اشاریہ: شاہد رضا

قیمت:

ISBN: 978-969-8799-50-2

---

Address: Post Box 5185, Lahore Pakistan.
Website: www.al-mawrid.org
Email : info@al-mawrid.org, almawrid@brain.net.pk

# ترتیب

# دیباچہ

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ میں نے اِس دین کو جس طرح سمجھا ہے، اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کر دیا ہے۔ یہ اسی کتاب کا خلاصہ ہے جس میں کتاب کا نفس مضمون اُس کے علمی مباحث اور اُن کے استدلالات سے الگ کر کے سادہ طریقے پر پیش کر دیا گیا ہے۔

دین کی تفہیم و تبیین کے لیے اِس وقت تک جو کچھ لکھا اور جو کچھ بیان کیا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی کے فیض تربیت کا نتیجہ ہے، اِس لیے دوسری تمام کتابوں کی طرح میری یہ کتاب بھی اُنھی سے معنون ہے:

طبع تو داد سرخط مشق سخن بما
گویی برات نور ز خاور گرفتہ ایم

المورد، لاہور ——— جاوید

۲۵/ دسمبر ۲۰۰۷ء

بسم الله الرحمن الرحیم

# دین حق

دین اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جو اُس نے پہلے انسان کی فطرت میں الہام فرمائی اور اِس کے بعد اُس کی تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسان کو دی ہے۔ اِس سلسلہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ دین کا تنہا ماخذ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات والا صفات ہے اور دین حق اب وہی ہے جسے آپ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب* سے دین قرار دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع** اور قولی و عملی تواتر*** سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے:

---

* اِس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز دین کی حیثیت سے آپ کے سامنے ہوئی اور آپ نے اُس سے منع نہیں کیا۔

** یعنی بغیر کسی اختلاف کے پورے اتفاق کے ساتھ۔

*** یعنی بغیر کسی انقطاع کے پشت بہ پشت پڑھتے، لکھتے، بیان کرتے اور اُس پر عمل کرتے ہوئے۔

۱۔ قرآن مجید

۲۔ سنت

قرآن مجید وہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے اور اپنے نزول کے بعد سے آج تک مسلمانوں کے پاس اُن کی طرف سے اس صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ یہی وہ کتاب ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور جسے آپ کے صحابہ نے اپنے اجماع اور قولی تواتر کے ذریعے سے پوری حفاظت کے ساتھ بغیر کسی ادنیٰ تبدیلی کے دنیا کو منتقل کیا ہے۔

سنت دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی تجدید و اصلاح کے بعد* اور اُس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔

اِس میں اور قرآن مجید میں ثبوت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح اُن کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت ہوتی ہے۔

اس دین کی حقیقت اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو قرآن کی اصطلاح میں وہ اللہ کی ''عبادت'' ہے۔ اس کے معنی عاجزی اور پستی کے ہیں۔ یہ چیز اگر اللہ تعالیٰ کی

---

* یعنی جو بھلایا جا چکا تھا، اُسے تازہ کرنے اور جس میں کوئی غلطی ہو رہی تھی، اُس کو درست کرنے کے بعد۔

صحیح معرفت کے ساتھ پیدا ہو تو اپنے آپ کو انتہائی محبت اور انتہائی خوف کے ساتھ اُس کے سامنے آخری حد تک جھکا دینے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ درحقیقت ایک داخلی کیفیت ہے۔ خدا کا ذکر، اُس کا شکر، اُس کی ناراضی کا خوف، اُس کے ساتھ اخلاص، اُس پر بھروسا اور اُس کے حضور میں تسلیم و رضا اِس کیفیت کے باطنی مظاہر ہیں۔ انسان کے ظاہری وجود میں یہی چیز پرستش کے مظاہر، یعنی رکوع و سجود، تسبیح و تحمید، دعا و مناجات اور نذر و نیاز کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ پھر انسان چونکہ اس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اِس وجہ سے اپنے اِس ظہور سے آگے بڑھ کر یہ انسان کے اُس عملی وجود سے متعلق ہوتی اور پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اُس وقت یہ انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ ظاہر و باطن، دونوں میں وہ خدا کا بندہ بن کر رہے۔

اللہ اور بندے کے درمیان عبد و معبود کے اِس تعلق کے لیے یہ عبادت جب اپنی اساسات متعین کرتی، مراسم طے کرتی اور دنیا میں اِس تعلق کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے حدود و قیود مقرر کرتی ہے تو قرآن کی زبان میں اِسے دین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی جو صورت اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسانوں پر واضح کی ہے، قرآن اُسے 'دین الحق' کہتا ہے اور اُس کے بارے میں اُنھیں ہدایت کرتا ہے کہ وہ اُسے بالکل درست اور اپنی زندگی میں پوری طرح برقرار رکھیں اور اُس میں کوئی تفرقہ پیدا نہ کریں۔

اِس عبادت کے لیے ایمان واخلاق کی جو اساسات خدا کے اِس دین میں بیان ہوئی ہیں، اُنھیں قرآن ’الحکمۃ‘ اور اِس کے مراسم اور حدود و قیود کو ’الکتاب‘ کہتا ہے۔ اِس کے لیے ایک دوسرا لفظ ’’شریعت‘‘ بھی ہے۔اِس کے معنی وہی ہیں جو ہم لفظ قانون سے ادا کرتے ہیں۔

’الحکمۃ‘ ہمیشہ سے ایک ہی ہے، لیکن شریعت انسانی تمدن میں ارتقا اور تبدیلیوں کے باعث، البتہ بہت کچھ مختلف رہی ہے۔

الہامی لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات میں زیادہ تر شریعت اور انجیل میں حکمت بیان ہوئی ہے۔ زبور اِسی حکمت کی تمہید میں اللہ تعالیٰ کی تمجید کا مزمور ہے اور قرآن اِن دونوں کے لیے ایک جامع شہ پارۂ ادب اور صحیفۂ انذار و بشارت کی حیثیت سے نازل ہوا ہے۔

’الحکمۃ‘ کی تعبیر جن مباحث کے لیے اختیار کی گئی ہے، وہ بنیادی طور پر دو ہیں:

ایک ایمانیات۔

دوسرے اخلاقیات۔

’الکتاب‘ کے تحت جو مباحث بیان ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ قانون عبادات۔ ۲۔ قانون معاشرت۔ ۳۔ قانون سیاست۔ ۴۔ قانون معیشت۔ ۵۔ قانون دعوت۔ ۶۔ قانون جہاد۔ ۷۔ حدود و تعزیرات۔ ۸۔ خورونوش۔ ۹۔ رسوم و آداب۔ ۱۰۔ قسم اور کفارۂ قسم۔

یہی سارا دین ہے۔ خدا کے جو پیغمبر اِس دین کو لے کر آئے، اُنھیں نبی کہا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں سے بعض ''نبوت'' کے ساتھ ''رسالت'' کے منصب پر بھی فائز ہوئے تھے۔

''نبوت'' یہ ہے کہ انسانوں میں سے کوئی شخص وحی پا کر لوگوں کو حق بتائے اور اُس کے ماننے والوں کو قیامت میں اچھے انجام کی خوش خبری دے اور نہ ماننے والوں کو برے انجام سے خبردار کرے۔ قرآن اِسے ''انذار'' اور ''بشارت'' سے تعبیر کرتا ہے۔

''رسالت'' یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر فائز کوئی شخص اپنی قوم کے لیے اس طرح خدا کی عدالت بن کر آئے کہ اُس کی قوم اگر اُسے جھٹلا دے تو اُس کے بارے میں خدا کا فیصلہ اسی دنیا میں اُس پر نافذ کر کے وہ حق کا غلبہ عملاً اُس پر قائم کر دے۔

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو اپنی جزا و سزا کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ اُن کے ذریعے سے اسی دنیا میں برپا کر دیتے ہیں۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہیں گے تو اِس کی جزا اور اس سے انحراف کریں گے تو اس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کا وجود لوگوں کے لیے خدا کی نشانی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا اُن کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اِس کے ساتھ اُنھیں حکم دیا جاتا ہے کہ جس حق کو وہ سر کی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، اُس کی تبلیغ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت بے کم و کاست اور پوری قطعیت

کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیں۔ قرآن کی تعبیر کے مطابق یہ "شہادت" ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو غلبہ عطا فرماتے اور اِن کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔

شہادت کا یہ منصب رسولوں کے علاوہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو بھی عطا ہوا ہے۔ قرآن نے اِسی کے پیش نظر اُنھیں خدا کے رسول اور اُس کے بندوں کے درمیان ایک جماعت قرار دیا اور بتایا ہے کہ اِس منصب کے لیے وہ اُسی طرح منتخب کیے گئے جس طرح انسانوں میں سے اللہ تعالیٰ بعض ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔

نبیوں اور رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بالعموم اپنی کتابیں بھی نازل فرمائی ہیں۔ اِن کے نزول کا مقصد قرآن میں یہ بیان ہوا ہے کہ حق و باطل کے لیے یہ میزان قرار پائیں تاکہ اِن کے ذریعے سے لوگ اپنے اختلافات کا فیصلہ کر سکیں اور اِس طرح حق کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔

نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا ہے۔ آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد وحی والہام کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے اور نبوت ختم کر دی گئی ہے۔ چنانچہ لوگوں کو دین پر قائم رکھنے کے لیے "انذار" کی ذمہ داری اب قیامت تک اِس امت کے علما ادا کریں

گے۔

اِس دین کا نام ''اسلام'' ہے اور اِس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ انسانوں سے وہ اِس کے سوا ہرگز کوئی دوسرا دین قبول نہ کرے گا۔

''اسلام'' کا لفظ جس طرح پورے دین کے لیے استعمال ہوتا ہے، اِسی طرح دین کے ظاہر کو بھی بعض اوقات اِسی لفظ اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اپنے اِس ظاہر کے لحاظ سے یہ پانچ چیزوں سے عبارت ہے:

۱۔ اِس بات کی شہادت دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے رسول ہیں۔

۲۔ نماز قائم کی جائے۔

۳۔ زکوٰۃ ادا کی جائے۔

۴۔ رمضان کے روزے رکھے جائیں۔

۵۔ بیت اللہ کا حج کیا جائے۔

دین کا باطن ایمان ہے۔ اِس کی جو تفصیل قرآن میں بیان ہوئی ہے، اُس کی رو سے یہ بھی پانچ ہی چیزوں سے عبارت ہے:

۱۔ اللہ پر ایمان۔

۲۔ فرشتوں پر ایمان۔

۳۔ نبیوں پر ایمان۔

۴۔ کتابوں پر ایمان۔

۵۔ روزِ جزا پر ایمان۔

یہ ایمان جب اپنی حقیقت کے اعتبار سے دل میں اترتا اور اُس سے اپنی تصدیق حاصل کر لیتا ہے تو اپنے وجود ہی سے دو چیزوں کا تقاضا کرتا ہے:

ایک عمل صالح،

دوسرے 'تواصی بالحق' اور 'تواصی بالصبر'۔

عمل صالح سے مراد ہر وہ عمل ہے جو تزکیۂ اخلاق کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تمام اساسات عقل و فطرت میں ثابت ہیں اور خدا کی شریعت اِسی عمل کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہے۔

'تواصی بالحق' اور 'تواصی بالصبر' کے معنی اپنے ماحول میں ایک دوسرے کو حق اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کے ہیں۔ قرآن نے اِس کو ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو عقل و فطرت کی رو سے معروف ہیں، اپنے قریبی ماحول میں لوگوں کو اُن کی تلقین کی جائے اور جو منکر ہیں، اُن سے لوگوں کو روکا جائے۔

عام حالات میں ایمان کے تقاضے یہی ہیں، لیکن انسان جس دنیا میں رہتا ہے، اُس کے لحاظ سے جو حالتیں اُس کو پیش آ سکتی ہیں، اُن کی رعایت سے اِن کے علاوہ تین اور تقاضے بھی اِس سے پیدا ہوتے ہیں:

ایک ہجرت؛

دوسرے نصرت؛

تیسرے قیام بالقسط۔

بندۂ مومن کے لیے اگر کسی جگہ اپنے پروردگار کی عبادت پر قائم رہنا جان جوکھم کا کام بن جائے؛ اُسے دین کے لیے ستایا جائے، یہاں تک کہ اپنے اسلام کو ظاہر کرنا ہی اُس کے لیے ممکن نہ رہے تو اُس کا یہ ایمان اُس سے تقاضا کرتا ہے کہ اُس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائے جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکے۔ قرآن اِسے ''ہجرت'' کہتا ہے اور پیغمبر کی طرف سے اِس کی دعوت کے بعد اپنے آپ کو اِس طرح کی صورت حال میں دیکھ کر اِس سے گریز کرنے والوں کو اُس نے دوزخ کی وعید سنائی ہے۔

اِسی طرح دین کو اپنے فروغ یا اپنی حفاظت کے لیے اگر کسی اقدام کی ضرورت پیش آجائے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ جان و مال سے دین کی مدد کی جائے۔ قرآن کی تعبیر کے مطابق یہ خدا کی ''نصرت'' ہے اور اُس کا مطالبہ ہے کہ ایمان کا یہ تقاضا اگر کسی وقت سامنے آجائے تو بندۂ مومن کو دنیا کی کوئی چیز بھی اِس سے زیادہ عزیز نہیں ہونی چاہیے۔

پھر اِس دنیا میں انسان کے جذبات، تعصبات، مفادات اور خواہشیں اگر دین و دنیا کے کسی معاملے میں اُسے انصاف کی راہ سے ہٹا دینا چاہیں تو یہی ایمان تقاضا کرتا ہے کہ بندۂ مومن نہ صرف یہ کہ حق و انصاف پر قائم رہے، بلکہ یہ اگر گواہی کا مطالبہ

کریں تو جان کی بازی لگا کر ان کا یہ مطالبہ پورا کرے۔ حق کہے، حق کے سامنے اپنا سر جھکا دے۔ انصاف کرے، انصاف کی گواہی دے اور اپنے عقیدہ وعمل میں انصاف کے سوا کبھی کوئی چیز اختیار نہ کرے۔ قرآن نے اس کے لیے ''قیام بالقسط'' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔

اِس دین کا جو مقصد قرآن میں بیان ہوا ہے، وہ قرآن کی اصطلاح میں تزکیہ ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو آلایشوں سے پاک کر کے اُس کے فکروعمل کو صحیح سمت میں نشوونما دی جائے۔ قرآن مجید میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ انسان کا نصب العین بہشت بریں کی بادشاہی ہے اور کامیابی کے اِس مقام تک پہنچنے کی ضمانت اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو اِس دنیا میں اپنا تزکیہ کر لیں۔ لہٰذا دین میں غایت اور مقصود کی حیثیت تزکیہ ہی کو حاصل ہے۔ اللہ کے نبی اسی مقصد کے لیے بھیجے گئے اور سارا دین اِسی مقصود کو پانے اور اِسی غایت تک پہنچنے میں انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔

اِس دین پر عمل کے لیے جو رویہ اِس کے ماننے والوں کو اختیار کرنا چاہیے، وہ ''احسان'' ہے۔ احسان کے معنی کسی کام کو اُس کے بہترین طریقے پر کرنے کے ہیں۔ اِس کی صورت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بندگی اِس طرح کرے کہ گویا وہ اُسے دیکھ رہا ہے، اِس لیے کہ اگر وہ اُسے نہیں دیکھ رہا تو اُس کا پروردگار تو اُسے دیکھ رہا ہے۔

حصہ اول

# الحکمۃ

۱

# ایمانیات

ایمان ایک دینی اصطلاح ہے۔ کسی چیز کو دل کے پورے یقین کے ساتھ تسلیم کرلیا جائے تو اِسے ایمان کہا جاتا ہے۔ اِس کی اصل خدا پر ایمان ہے۔ انسان اگر اپنے پروردگار کو اس طرح مان لے کہ تسلیم ورضا کے بالکل آخری درجے میں اپنے دل و دماغ کو اُس کے حوالے کردے تو قرآن کی اصطلاح میں وہ مومن ہے۔ ایمان کی یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر قرآن تقاضا کرتا ہے کہ انسان کے قول وعمل کو بھی اِس پر گواہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہر نیکی کو وہ ایمان کا خاصہ اور ایمان والوں کا لازمی وصف بتاتا ہے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ قانون کی نگاہ میں ہر وہ شخص مومن ہے جو زبان سے اسلام کا اقرار کرتا ہے۔ اُس کا یہ ایمان کم یا زیادہ بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن جہاں تک حقیقی ایمان کا تعلق ہے، وہ ہرگز کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ اللہ کے ذکر اور اُس کی آیتوں کی تلاوت اور انفس و آفاق میں اُن کے ظہور سے اُس میں افزونی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے اُسے ایک ایسے درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں

اتری ہوئی اور شاخیں آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔

یہی معاملہ ایمان میں کمی کا ہے۔ انسان اگر اپنے ایمان کو علم نافع اور عمل صالح سے برابر بڑھاتے رہنے کے بجائے اُس کے تقاضوں کے خلاف عمل کرنا شروع کردے تو یہ کم بھی ہوتا ہے، بلکہ بعض حالات میں بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

اِس سے واضح ہے کہ ایمان اور عمل لازم وملزوم ہیں۔ لہٰذا جس طرح ایمان کے ساتھ عمل ضروری ہے، اِسی طرح عمل کے ساتھ ایمان بھی ضروری ہے۔ نجات کے لیے قرآن نے ہر جگہ اِسے شرط اولین قرار دیا ہے۔

یہ ایمان درج ذیل پانچ چیزوں سے عبارت ہے:

۱۔ اللہ پر ایمان

۲۔ فرشتوں پر ایمان

۳۔ نبیوں پر ایمان

۴۔ کتابوں پر ایمان

۵۔ روز جزا پر ایمان

## اللہ پر ایمان

اللہ اُس ہستی کا نام ہے جو زمین و آسمان اور تمام مخلوقات کی خالق ہے۔ یہ نام ابتدا ہی سے پروردگار عالم کے لیے خاص رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب

جاہلیت میں بھی یہ اِسی مفہوم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ دین ابراہیمی کے جو باقیات عربوں کو وراثت میں ملے تھے، یہ لفظ بھی اُنھی میں سے ہے۔

اِس ہستی کا اقرار ایک ایسی چیز ہے جو ازل ہی سے انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ یہ معاملہ ایک عہد و میثاق کی صورت میں ہوا ہے۔ اِس عہد کا ذکر قرآن ایک امر واقعہ کی حیثیت سے کرتا ہے۔ انسان کو یہاں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اِس لیے یہ واقعہ تو اُس کی یادداشت سے محو کر دیا گیا ہے، لیکن اِس کی حقیقت اُس کے صفحۂ قلب پر نقش اور اُس کے نہاں خانۂ دماغ میں پیوست ہے، اِسے کوئی چیز بھی محو نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ماحول میں کوئی چیز مانع نہ ہو اور انسان کو اِسے یاد دلایا جائے تو وہ اِس کی طرف اُسی طرح لپکتا ہے، جس طرح بچہ ماں کی طرف لپکتا ہے، دراں حالیکہ اُس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا، اور اِس یقین کے ساتھ لپکتا ہے، جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اِس کو جانتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کا یہ اقرار اُس کی ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب ہے جو اُس کے اندر ہی موجود تھا۔ اُس نے اِسے پا لیا ہے تو اُس کی نفسیات کے تمام تقاضوں نے بھی اِس کے ساتھ ہی اپنی جگہ پا لی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ نفس انسانی کی یہ شہادت ایسی قطعی ہے کہ جہاں تک خدا کی ربوبیت کا تعلق ہے، ہر شخص مجرد اِس شہادت کی بنا پر اللہ کے حضور میں جواب دہ ہے۔

انسان کے باطن کی اِس رہنمائی کے ساتھ یہ صلاحیت بھی اُسے دی گئی ہے کہ

اپنے ظاہری حواس سے جو کچھ وہ دیکھتا، سنتا اور محسوس کرتا ہے، اُس سے بعض ایسے حقائق کا استنباط کرے جو ماورائے حواس ہیں۔ اِس کی ایک سادہ مثال قانون تجاذب (Law of Gravitation) ہے۔ سیب درخت سے ٹوٹتا ہے تو زمین پر گر پڑتا ہے۔ پتھر کو زمین سے اٹھانا ہو تو اِس کے لیے طاقت خرچ کرنا پڑتی ہے۔ سیڑھیاں اترنے کے مقابلے میں چڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ چاند اور تارے آسمان میں گردش کرتے ہیں۔ انسان اِن چیزوں کو صدیوں سے دیکھ رہا تھا، یہاں تک کہ نیوٹن نے ایک دن انکشاف کیا کہ یہ سب قانون تجاذب کا کرشمہ ہے۔ یہ قانون بذات خود ناقابل مشاہدہ ہے، لیکن اِس وقت پوری دنیا اِس کو ایک سائنسی حقیقت کے طور پر تسلیم کرتی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظریہ تمام معلوم حقائق سے ہم آہنگ ہے۔ اِس سے تمام مشاہدات کی توجیہ ہو جاتی ہے اور دوسرا کوئی نظریہ ابھی تک ایسا سامنے نہیں آیا جو واقعات سے اِس درجہ مطابقت رکھتا ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ محسوس سے غیر محسوس کا استنباط ہے۔ انسان جب اپنی اِس صلاحیت کو کام میں لا کر اپنا اور اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی کائنات کا مطالعہ کرتا ہے تو اُس کا یہ مطالعہ بھی اُس کے باطن میں نہاں اِسی حقیقت کی گواہی دیتا ہے۔

چنانچہ وہ دیکھتا ہے کہ اِس دنیا کی ہر چیز حسن تخلیق کا معجزانہ اظہار ہے؛ ہر چیز میں اتھاہ معنویت ہے، غیر معمولی اہتمام ہے؛ حکمت، تدبیر، منفعت اور حیرت انگیز نظم و ترتیب ہے؛ بے مثال اقلیدس اور ریاضی ہے جس کی کوئی توجیہ اِس کے سوا نہیں ہو سکتی

کہ اِس کا ایک خالق ہے اور یہ خالق کوئی اندھی اور بہری طاقت نہیں ہے، بلکہ ایک لامحدود ذہن ہے۔ اِس لیے کہ طاقت کا ظہور اگر کسی علیم و حکیم ہستی کی طرف سے نہ ہو تو اُسے جبر محض ہونا چاہیے، مگر یہ حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اِس میں غایت درجہ موزونیت ہے، بے پناہ توافق ہے، اِس سے غیر معمولی فوائد اور عجیب و غریب تغیرات پیدا ہوتے ہیں جو کسی اندھی اور بہری طاقت سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتے۔

یہ شواہد اگرچہ کافی تھے، مگر لوگوں پر اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مزید اہتمام یہ فرمایا کہ انسانیت کی ابتدا ایک ایسے انسان سے کی جس نے خدا کی بات سنی، اُس کے فرشتوں کو دیکھا اور اِس طرح حقیقت کے براہ راست مشاہدے کی گواہی دے کر دنیا سے رخصت ہوا تاکہ اُس کا یہ علم نسل در نسل اُس کی ذریت کو منتقل ہوتا رہے اور خدا کا تصور انسانی زندگی کے کسی دور، زمین کے کسی خطے، کسی بستی، کسی پشت اور کسی نسل کے لیے کبھی اجنبی نہ ہونے پائے۔

پھر یہی نہیں، پہلے انسان کی حیثیت سے آدم و حوا کو دنیا میں بھیجنے کے بعد ایک عرصے تک یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ بنی آدم اگر اپنے ایمان و عمل کی قبولیت یا عدم قبولیت اِسی دنیا میں جاننا چاہیں تو جان لیں۔ یہ گویا حقیقت کو اُس زمانے کے ہر شخص کے لیے تجربے اور مشاہدے کے درجے تک پہنچا دینا تھا تاکہ اپنے ماں باپ کے ساتھ وہ بھی اِس گواہی میں شامل ہو جائے۔ اِس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور قربانی پیش کرتے، پھر آسمان سے ایک آگ اترتی اور قبولیت کی علامت کے طور پر

اُسے کھا لیتی تھی۔

اِس سے واضح ہے کہ خدا کا وجود ایک بدیہی حقیقت ہے جس کا تصور انسان اپنے آبا سے لے کر آیا ہے اور جس کی گواہی نفس اور مادہ، دونوں اپنے وجود سے دیتے ہیں۔ لیکن خدا کی ذات کیا ہے؟ اُس کی صفات کیا ہیں؟ وہ سنن کیا ہیں جو اُس نے اپنی ذات کے لیے مقرر کر رکھے ہیں؟ انسان اگر اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کرنا چاہے تو یہ سوالات اُس کے ذہن میں لازماً پیدا ہوتے ہیں۔ ایمان کے لیے یہ معرفت ضروری ہے۔ قرآن نے جب اللہ تعالیٰ پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے تو اِن سوالوں کا جواب بھی دیا ہے۔ یہ جواب کیا ہے؟ ہم یہاں اِس کی وضاحت کریں گے۔

## ذات

اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ وہ کسی طرح انسان کے حیطۂ ادراک میں نہیں آسکتی۔ اِس لیے کہ ادراک کے ذرائع جس ہستی نے پیدا کیے ہیں، وہ تو یقیناً اُنھیں پا سکتی اور اُن کا احاطہ بھی کر سکتی ہے، لیکن یہ ذرائع کسی طرح اُس کا احاطہ نہیں کر سکتے جو خود اُن کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

## صفات

اللہ تعالیٰ کی صفات، البتہ کسی نہ کسی درجے میں انسان کی گرفت میں آتی ہیں۔

اِس کی وجہ یہ ہے کہ صفات سے متعلق کچھ چیزیں، خواہ وہ کتنی ہی حقیر ہوں، انسان کے پاس بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم وخبر، قدرت، ربوبیت اور رحمت وحکمت کا کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرمایا ہے۔ اُس پر قیاس کر کے خدا کی اِن صفات کا کچھ تصور ہم قائم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ قرآن جب کہتا ہے کہ وہ خالق ہے، قدیر ہے، رحمٰن ورحیم ہے، علیم وحکیم ہے، حی وقیوم ہے، اول وآخر اور ظاہر وباطن ہے تو اِس سے خدا کی صفات کا ایک تصور یقیناً قائم ہو جاتا ہے۔

اِن صفات کے سمجھنے میں جو چیزیں ملحوظ رہنی چاہییں، اُن میں سے ایک اِن کی جہت حسن ہے۔ اِس لیے کہ قدرت اُسی وقت مدح کی مستحق ہے، جب وہ رحمت، کرم اور عدالت کے ساتھ ہو۔ غصے، انتقام اور قہر وغضب کا ظہور بھی ظلم وعدوان کے خلاف ہو تو قابل تحسین ہے۔ رحمت، مغفرت اور جود وکرم بھی اپنے محل ہی میں تعریف کے مستحق ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں غنی کے ساتھ حمید، علیم کے ساتھ حکیم اور عزیز کے ساتھ غفور کی صفات اِسی جہت حسن کی طرف رہنمائی کے لیے آئی ہیں۔

اِسی طرح یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا جو تصور بھی قائم کیا جائے گا، وہ جلال وجمال اور کمال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اکیلا، یکتا، پناہ کی چٹان، مثال کے طور پر، صفات کمال ہیں۔ منزہ، سلامتی، امن دینے والا صفات جمال اور بادشاہ، غالب، بڑے زور والا صفات جلال ہیں۔ انسان کے دل میں صفات جلال سے خوف، تعظیم اور مدح کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور صفات جمال سے حمد، رجا اور

محبت کے۔ پھر صفات جلال حواس کے لیے زیادہ ظاہر اور صفات جمال عقل و دل کے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ پروردگار کو سامنے رکھا جائے تو صفات جمال کا غلبہ محسوس ہوتا ہے اور نفس انسانی نگاہوں کے سامنے ہو تو جلال کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ انسان خدا سے ڈر کر اِسی بنا پر خدا کی طرف لپکتا اور اُس کی صفات جمال کے دامن میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قرآن مجید جب یہ کہتا ہے کہ تمام اچھے نام اُسی کے ہیں تو اِس کے معنی اُس کے نزدیک یہی ہوتے ہیں کہ ہر وہ نام جو خدا کے جلال و جمال اور اُس کے کمال کو بیان کرتا ہے، وہ اچھا ہے اور اُس سے خدا کو پکارا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کمال اِس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں کہ اُن سے اُس کی عظمت نمایاں ہوتی ہے۔ انسان جب اُن کا صحیح تصور قائم کر لیتا ہے تو اِس کے نتیجے میں ایک ایسے خدا پر ایمان لاتا ہے جو یگانہ، یکتا اور بے ہمتا ہے؛ سب کے لیے پناہ کی چٹان ہے؛ زمین و آسمان اور اُن کے درمیان کی ہر چیز کا تنہا مالک ہے؛ اُس کی بادشاہی میں کوئی دوسرا شریک نہیں، اُس کے کارخانۂ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں؛ دنیا کی کوئی چیز اُس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں؛ عالم کا کوئی معاملہ اُس کے حکم سے باہر نہیں؛ ہر چیز اُس کی محتاج ہے، مگر اُس کو کسی کی احتیاج نہیں؛ جمادات، نباتات، حیوانات، سب اُس کے حضور میں سجدہ ریز اور اُس کی تسبیح و تہلیل میں مشغول ہیں؛ اُس کی قدرت بے انتہا، اُس کی وسعت غیر محدود اور اُس کی مشیت کائنات کے ذرے ذرے میں کارفرما ہے؛ وہ جب چاہے اور جس چیز کو چاہے فنا کرے اور جب

چاہے اُس کو پھر پیدا کر دے؛ عزت و ذلت، سب اُسی کے ہاتھ ہے؛ سب فانی ہیں، وہی باقی ہے؛ وہ وراء الوراء ہے، مگر رگ جاں سے قریب ہے؛ اُس کا علم اور اُس کی قدرت ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے؛ وہ دلوں کے بھید تک جانتا ہے؛ اُس کا ارادہ ہر ارادے میں نافذ اور اُس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے؛ وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے۔

اِن صفات کمال میں اہم ترین اللہ تعالیٰ کی توحید ہے۔ قرآن مجید نے سب سے زیادہ تاکید اور وضاحت کے ساتھ اِسے ہی بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ اِس صحیفۂ آسمانی کا آخری باب اپنے مضمون کے لحاظ سے جس سورہ پر ختم ہوا ہے، اُس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ہدایت فرمائی ہے کہ لوگوں کے سامنے برملا اعلان کر دیا جائے کہ اللہ یکتا ہے، سب کا سہارا ہے، وہ نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا اور اُس کا کوئی ہم سر بھی نہیں ہے۔

توحید کی یہی اہمیت ہے جس کے پیش نظر قرآن نے صراحت کی ہے کہ اِس کے بغیر انسان کا کوئی عمل مقبول نہیں ہے اور اِس کے ساتھ ہر غلطی کے بخشے جانے کی توقع ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ توحید پر ایمان کے ساتھ بندہ نہ گناہ پر سرکش ہو سکتا ہے اور نہ اُس کا ارتکاب کر لینے کے بعد توبہ و استغفار کی توفیق سے محروم رہ سکتا ہے۔ وہ لازماً پروردگار کی طرف لوٹتا ہے اور اِس طرح قیامت کی پیشی سے پہلے ہی اپنے لیے عفو و درگذر کا استحقاق پیدا کر لیتا ہے۔

توحید کے جو دلائل قرآن میں آئے ہیں، وہ نہایت دل نشیں اور علم و عقل کے مسلمات پر مبنی ہیں۔ یہاں اتنی بات کافی ہے کہ خدا کی خدائی میں شریک ٹھیرانے کے لیے کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن نے اپنے مخاطبین سے ایک سے زیادہ مقامات پر مطالبہ کیا ہے کہ عقل و نقل سے اس کی دلیل پیش کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں، اِس کے لیے اصلی گواہی خود خدا ہی کی ہو سکتی ہے اور خدا کی گواہی کو جاننے کا واحد ذریعہ اُس کی نازل کردہ کتابیں اور وہ روایات و آثار ہیں جو اُس کے نبیوں اور رسولوں سے نسل در نسل انسانیت کو منتقل ہوئے ہیں۔ اُن میں شرک کی تائید کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔

## سنن

اللہ تعالیٰ جو معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ کرتے اور جس طریقے سے کرتے ہیں، اُسے قرآن میں سنت الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ سنن ناقابل تغیر ہیں، اِن میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ چنانچہ خدا کی معرفت کے لیے جس طرح اُس کی صفات کا علم ضروری ہے، اِسی طرح ان سنن الٰہیہ کا علم بھی ضروری ہے۔ یہ سنن درج ذیل ہیں:

### ۱۔ ابتلا

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے۔ خدا کے ایک عالمگیر قانون کی حیثیت سے یہ امتحان تمام عالم انسانیت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ انسان کی طبیعت میں جو کچھ

ودیعت ہے، وہ اسی امتحان سے نمایاں ہوتا، نفس کے اسرار اسی سے کھلتے اور علم وعمل کے درجات اِسی سے متعین ہوتے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ موت وحیات کا یہ کارخانہ وجود میں آیا ہی اس لیے ہے کہ اِس کا پروردگار دیکھ لے کہ کون سرکشی اختیار کرتا اور کون اُس کی پسند کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے، لیکن اُس نے یہ سنت ٹھیرائی ہے کہ لوگوں کے ساتھ جزا وسزا کا معاملہ وہ مجرد اپنے علم کی بنیاد پر نہ کرے گا۔ یہ امتحان اِسی مقصد سے برپا کیا گیا ہے۔

اِس دنیا میں رنج وراحت، غربت وامارت، دکھ اور سکھ کی جو حالتیں انسان کو پیش آتی ہیں، وہ اسی قانون کے تحت ہیں۔ اِن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا اور اِن کے کھوٹے اور کھرے میں امتیاز فرماتا ہے۔ وہ کسی کو مال ودولت اور عزوجاہ سے نوازتا ہے تو اُس کے شکر کا امتحان کرتا ہے اور کسی کو فقر ومسکنت میں مبتلا کرتا ہے تو اُس کے صبر کا امتحان کرتا ہے۔

## ۲۔ ہدایت وضلالت

اِس ابتلا میں انسان سے تقاضا کیا گیا ہے کہ گمراہی سے بچے اور اپنے لیے ہدایت کا راستہ اختیار کرے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ ہدایت اُس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ پھر شعور کو پہنچنے کے بعد زمین وآسمان کی نشانیاں اس کی طرف اُسے متوجہ کرتی ہیں۔ انسان اگر اس ہدایت کی قدر کرے، اِس سے فائدہ اٹھائے اور خدا کی اس نعمت پر اُس کا شکرگزار ہو تو خدا کی سنت ہے کہ وہ اِس کی روشنی کو اُس کے لیے بڑھاتا، اُس

کے اندر مزید ہدایت کی طلب پیدا کرتا اور اِس کے نتیجے میں انبیا علیہم السلام کی لائی ہوئی ہدایت سے اُس کو بہرہ یاب ہونے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

انسان اِس فطری ہدایت سے اعراض کا فیصلہ کر لے، اپنی عقل سے کام نہ لے اور جانتے بوجھتے حق سے انحراف کرے تو قرآن کی اصطلاح میں یہ ظلم اور فسق ہے اور خدا کسی ظالم اور فاسق کو کبھی ہدایت نہیں دیتا، بلکہ اُسے گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

## ۳۔ تکلیف ما لا یطاق

انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے جو شریعت انسانوں کو دی گئی ہے، اُس میں اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے کوئی ایسا حکم کبھی نہیں دیتا جو انسان کے تحمل سے باہر ہو۔ اُس کے تمام اعمال میں یہ معیار ہمیشہ سے قائم ہے کہ لوگوں کی طاقت سے زیادہ کوئی بوجھ اُن پر نہ ڈالا جائے اور جو حکم بھی دیا جائے، انسان کی فطرت کے مطابق اور اُس کی صلاحیتوں کو تول کر دیا جائے۔ چنانچہ بھول چوک، غلط فہمی اور بلا ارادہ کوتاہی پر اِس شریعت میں کوئی مواخذہ نہیں ہے اور لوگوں سے اِس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں وہ پوری صداقت اور دیانت داری کے ساتھ اُس کے احکام کی تعمیل کریں۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بندے اگر سرکشی اختیار کر لیں تو اُس وقت بھی اللہ تعالیٰ اُنھیں کوئی ایسی تکلیف نہیں دیتے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ تادیب و تربیت کے لیے، تعذیب کے لیے یا لوگوں کے برے اعمال کا نتیجہ اُن کو دکھانے یا خدا کے مقابلے میں اُن کا عجز

اُن پر ظاہر کر دینے کے لیے اِس طرح کی تکلیف یقیناً دی جاتی ہے۔

## ۴۔ عزل و نصب

ابتلا کا جو قانون اِس سے پہلے بیان ہوا ہے، اُس کے تحت اللہ تعالیٰ جس طرح افراد کو صبر یا شکر کے امتحان کے لیے منتخب کرتا ہے، اِسی طرح قوموں کو بھی منتخب کرتا ہے۔ اِس انتخاب کے نتیجے میں جب کوئی قوم ایک مرتبہ سرفرازی حاصل کر لیتی ہے تو اللہ اُس کے ساتھ اپنا معاملہ اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ علم و اخلاق کے لحاظ سے اپنے آپ کو پستی میں نہیں گرا دیتی۔ یہ خدا کی غیر متبدل سنت ہے اور اپنی اس سنت کے مطابق جب کسی قوم کے لیے بار بار کی تنبیہات کے بعد وہ ذلت و نکبت کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُس کا یہ فیصلہ کسی کے ٹالے نہیں ٹلتا اور دنیا کی کوئی قوت بھی خدا کے مقابلے میں اُس قوم کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ انسان کی پوری تاریخ قوموں کے عزل و نصب میں اِس سنت کے ظہور کی گواہی دیتی ہے۔

## ۵۔ نصرتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ جب اپنا کوئی مشن کسی فرد یا جماعت کے سپرد کرتا اور اُس کو اِسے پورا کرنے کا حکم دیتا ہے تو اُس کی مدد بھی فرماتا ہے۔ یہ مشن دعوت کا بھی ہو سکتا ہے اور جہاد و قتال کا بھی۔ اِس طرح کے کسی مشن کو پورا کرنے میں ایمان والوں کی مدد اللہ نے اپنے اوپر لازم کر رکھی ہے۔ یہ مدد الل ٹپ نہیں ہوتی، اِس کا ایک ضابطہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ضابطہ قرآن میں بیان فرمایا ہے۔ اُس کے بندوں کو یہ مدد اِس ضابطے کے

مطابق حاصل ہوتی ہے۔

## ۶۔ توبہ و استغفار

انسان جب کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے تو اِس کے لیے توبہ و استغفار کی گنجایش ہے۔ اِس معاملے میں قاعدہ یہ ہے کہ وہ اگر گناہ کے فوراً بعد توبہ کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے لازماً معاف کر دیتا ہے۔ لیکن اُن لوگوں کی توبہ ہرگز قبول نہیں کرتا جو زندگی بھر گناہوں میں ڈوبے رہتے اور جب دیکھتے ہیں کہ موت سر پر آن کھڑی ہوئی ہے تو توبہ کا وظیفہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اِسی طرح جانتے بوجھتے حق کا انکار کر دینے والوں کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی، اگر وہ موت کے وقت تک اِس انکار پر قائم رہے ہوں۔

## ۷۔ جزا و سزا

موت کے بعد جزا و سزا تو ایک اٹل حقیقت ہے، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات یہ اِس دنیا میں بھی دی جاتی ہے۔ خدا کی عدالت کا جو ظہور قیامت کے دن اُس کے منتہاے کمال پر ہونے والا ہے، یہ اُسی کی تمہید ہے۔ اِس کی جو صورتیں اللہ تعالیٰ نے بالکل متعین طریقے پر بیان فرمائی ہیں، وہ یہ ہیں:

اولاً، جو لوگ دنیا کے طالب ہوتے ہیں، اُسی کے لیے جیتے، اُسی کے لیے مرتے اور آخرت سے بالکل بے پروا ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اُن کا حساب اللہ تعالیٰ جس کو جتنا چاہتا ہے، دے کر اِسی دنیا میں بے باق کر دیتا ہے اور اُن کی تمام کارگزاریوں کا پھل اُنھیں یہیں مل جاتا ہے۔

ثانیاً، رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد اُن کے منکرین پر اِسی دنیا میں عذاب آجاتا ہے اور ماننے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

ثالثاً، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اگر حق پر قائم ہو تو اُسے قوموں کی امامت حاصل ہو گی اور انحراف کرے تو اِس منصب سے معزول کر کے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دی جائے گی۔

## فرشتوں پر ایمان

اللہ تعالیٰ جن ہستیوں کے ذریعے سے مخلوقات کے لیے اپنا حکم نازل کرتے ہیں، اُنھیں فرشتے کہا جاتا ہے۔ قرآن میں اُن کے لیے 'الملئکة' کا لفظ آیا ہے۔ یہ 'ملك' کی جمع ہے جس کے معنی پیام بر کے ہیں۔ چنانچہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم لاہوت کے ساتھ اِس عالم ناسوت کا رابطہ اُن کی وساطت سے قائم ہوتا اور اِس کا تمام کاروبار اللہ تعالیٰ اُنھی کے ذریعے سے چلاتے ہیں۔ اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بارگاہ خداوندی سے جو حکم اُنھیں القا کیا جاتا ہے، اُس کو وہ ایک محکوم محض کی طرح اُس کی مخلوقات میں جاری کر دیتے ہیں۔ اِس میں اُن کا کوئی ذاتی اختیار اور ذاتی ارادہ کارفرما نہیں ہوتا۔ وہ سرتاپا اطاعت ہیں، ہر وقت اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں اور اُس کے حکم سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے۔

# نبیوں پر ایمان

بنی آدم کے لیے اتمام ہدایت کا اہتمام اللہ تعالیٰ نے جن ہستیوں کے ذریعے سے کیا ہے، اُنھیں نبی کہا جاتا ہے۔ یہ انسان ہی تھے، لیکن اللہ نے اپنے علم و حکمت کی بنیاد پر اُنھیں اِس منصب کے لیے منتخب فرمایا۔ یہ ایک موہبت ربانی ہے، تعلیم و تربیت اور اخذ و اکتساب سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس حیثیت سے وہی لوگ منتخب کیے جاتے ہیں جو نفس اور شیطان کی ترغیبات سے اپنے آپ کو بچاتے، گناہوں سے محفوظ رہتے اور ہر لحاظ سے اپنی قوم کے صالحین و اخیار ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ نبی ہر قوم کی طرف بھیجے ہیں۔ آدم علیہ السلام سے اللہ نے وعدہ کیا تھا کہ اُن کی ذریت کی رہنمائی کے لیے وہ خود اپنی طرف سے ہدایت نازل کرے گا۔ یہ ہدایت اِنھی نبیوں کے ذریعے سے بنی آدم کو دی گئی۔ وہ آسمان سے وحی پا کر لوگوں کو حق بتاتے، اُس کے ماننے والوں کو اچھے انجام کی خوش خبری دیتے اور نہ ماننے والوں کو برے انجام سے خبردار کرتے تھے۔

نبیوں کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ انسان اپنے پروردگار کو پہچانے اور اُسے خیر و شر میں امتیاز کا شعور دیا جائے۔ یہ سب چیزیں تو اُس کی خلقت کا حصہ اور اُس کی تخلیق کے پہلے دن ہی سے اُس کی فطرت میں ودیعت ہیں۔ لہٰذا یہ ضرورت اِن

چیزوں سے واقف کرانے کے لیے نہیں، بلکہ دو وجوہ سے پیش آئی ہے:

ایک، اتمام ہدایت کے لیے۔ یعنی انسان کی فطرت میں جو کچھ بالاجمال ودیعت ہے اور جو کچھ وہ ہمیشہ سے جانتا ہے، اُس کی یاددہانی کی جائے اور اُس کی ضروری تفصیلات کے ساتھ اُس کے لیے اُسے بالکل متعین کر دیا جائے۔

دوسرے، اتمام حجت کے لیے۔ یعنی انسان کو غفلت سے بیدار کیا جائے اور علم وعقل کی شہادت کے بعد اِن نبیوں میں سے خاص کر رسولوں کے ذریعے سے ایک دوسری شہادت بھی پیش کر دی جائے جو حق کو اِس درجہ واضح کر دے کہ کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے یہ دونوں چیزیں عالمی سطح پر اور بالکل آخری درجے میں حاصل ہو گئی ہیں، اِس لیے نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے اعلان کیا ہے کہ آپ آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد اب کوئی نبی اور رسول نہیں آئے گا۔

اِن نبیوں کو پہچاننے میں کسی سلیم الفطرت شخص کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔ انسان کے دل ودماغ بیدار ہوں تو روے وآواز پیمبر معجزہ ست۔ تاہم اِس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اُن کو ایسی بینات بھی عطا فرماتے ہیں کہ معاندین اگرچہ زبان سے اقرار نہ کریں، لیکن اُن کی صداقت پر یقین کے سوا اُن کے لیے بھی کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بینات ہر نبی کو اُس کے زمانہ اور حالات کے لحاظ سے دی جاتی ہیں۔ اِن میں سے چند کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔

۱۔ نبی بالعموم اپنے سے پہلے نبی کی پیشین گوئی کے مطابق اور اُس کا مصداق بن کر آتا ہے۔ اِس لحاظ سے وہ کوئی اجنبی شخصیت نہیں ہوتا۔ لوگ اُس سے متعارف بھی ہوتے ہیں اور اُس کے منتظر بھی۔ مسیح علیہ السلام کے بارے میں صراحت ہے کہ سیدنا یحییٰ نے اُن کی بعثت سے پہلے یروشلم میں اُن کی منادی کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت تورات و انجیل، دونوں میں بیان ہوئی ہے، بلکہ سیدنا مسیح کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ نبی امی کی بشارت کے لیے آئے تھے۔ قرآن نے اپنی صداقت کے لیے اِسے ایک برہان قاطع کی حیثیت سے پیش کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے علما اُس کو اِس طرح پہچانتے ہیں، جس طرح ایک مہجور باپ اپنے موعود و منتظر بیٹے کو پہچانتا ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خوب پہچانتے تھے۔

۲۔ نبی جو کچھ خدا کی طرف سے اور خدا کے کلام کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، اُس میں کوئی تضاد و تخالف نہیں ہوتا۔ دنیا میں آخری درجے کا کوئی عبقری بھی، خواہ وہ سقراط و فلاطوں ہو یا کانٹ اور آئن اسٹائن، غالب و اقبال ہو یا رازی و زمخشری، اپنی تخلیقات کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن قرآن نے یہ بات اپنے بارے میں کہی ہے اور پورے زور کے ساتھ کہی ہے کہ اُس میں فکر و خیال کا کوئی ادنیٰ تناقض بھی تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا انسان بھی ہو سکتا ہے جو سال ہا سال تک مختلف حالات میں اور مختلف موقعوں پر اِس طرح کے متنوع موضوعات پر تقریریں

کرتا رہے اور شروع سے آخر تک اُس کی یہ تمام تقریریں جب مرتب کی جائیں تو ایک ایسے ہم رنگ اور متوافق مجموعۂ کلام کی صورت اختیار کر لیں جس میں نہ خیالات کا کوئی تصادم ہو، نہ متکلم کے دل و دماغ میں پیدا ہونے والی کیفیات کی کوئی جھلک دکھائی دے اور نہ رائے اور نقطۂ نظر کی تبدیلی کے کوئی آثار کہیں دیکھے جا سکتے ہوں؟ یہ تنہا قرآن ہی کی خصوصیت ہے۔

۳۔ نبی کو اللہ تعالیٰ معجزات و خوارق عطا فرماتے ہیں۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا مسیح کو جو غیر معمولی معجزات دیے گئے، اُن کے بارے میں خود قرآن نے صراحت فرمائی ہے کہ وہ جن چیزوں پر دلالت کے لیے دیے گئے، اُن میں سے ایک اِن نبیوں کی رسالت بھی تھی۔ اِن معجزات کو کوئی شخص سحر و ساحری یا علم و فن کا کمال کہہ کر رد نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اِس طرح کے علوم و فنون کی حقیقت اُس کے ماہرین سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا اور وہ بھی اِن کے سامنے اعتراف عجز پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معجزہ اِس حیثیت سے دیا گیا، وہ قرآن ہے۔ عربی زبان کے اسالیب بلاغت اور علم و ادب کی روایت سے واقف ادبی ذوق کے حاملین اِسے پڑھتے ہیں تو صاف محسوس کرتے ہیں کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک سے زیادہ مقامات پر اِس نے خود اپنے مخاطبین کو چیلنج کیا ہے کہ وہ اگر اپنے اِس گمان میں سچے ہیں کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے، بلکہ محمد اِسے اپنی طرف سے گھڑ کر پیش کر رہے ہیں تو جس شان کا یہ کلام ہے، اِس شان کی کوئی ایک سورت ہی بنا کر پیش کر دیں۔ اُن

کی قوم کا ایک فرد اگر اُن کے بقول بغیر کسی علمی اور ادبی پس منظر کے یہ کام کر سکتا ہے تو اُنھیں بھی اِس میں کوئی دقت نہ ہونی چاہیے۔

خدا کی یہ کتاب اِس وقت بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اِس پر کم و بیش چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ اِس عرصے میں دنیا کیا سے کیا ہوگئی۔ بنی آدم نے نظریہ و خیال کے کتنے بت تراشے اور پھر خود ہی توڑ دیے۔ انفس و آفاق کے بارے میں انسان کے نظریات میں کتنی تبدیلیاں آئیں اور اُس نے ترک و اختیار کے کتنے مرحلے طے کیے۔ وہ کس کس راہ سے گزرا اور بالآخر کہاں تک پہنچا، لیکن یہ کتاب جس میں بہت سی وہ چیزیں بھی بیان ہوئی ہیں جو اِن پچھلی صدیوں میں علم و تحقیق کا خاص موضوع رہی ہیں، دنیا کے سارے لٹریچر میں بس ایک ہی کتاب ہے جو اِس وقت بھی اُسی طرح اٹل اور محکم ہے، جس طرح اب سے چودہ سو سال پہلے تھی۔ علم و عقل اِس کے سامنے جس طرح اُس وقت اعتراف عجز کے لیے مجبور تھے، اُسی طرح آج بھی ہیں۔ اِس کا ہر بیان آج بھی پوری شان کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ دنیا اپنی حیرت انگیز علمی دریافتوں کے باوجود اِس میں کسی ترمیم و تغیر کے لیے کوئی گنجایش پیدا نہیں کر سکتی۔

۴۔ اللہ تعالیٰ بعض ایسے امور پر نبی کو مطلع کر دیتے ہیں جن کا جان لینا کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اِس کی ایک مثال وحی الٰہی کی پیشین گوئیاں ہیں جو حیرت انگیز طور پر بالکل صحیح ثابت ہوئیں۔ اِن میں سے بعض قرآن میں ہیں اور بعض کا ذکر روایتوں میں ہوا ہے۔ سرزمین عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبہ، فتح مکہ

اور لوگوں کے جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے کی پیشین گوئی سے قرآن کا ہر طالب علم واقف ہے۔ ایرانیوں سے مغلوب ہو جانے کے بعد رومیوں کی دوبارہ فتح کی پیشین گوئی بھی ایسی ہی غیر معمولی تھی۔

یہ پیشین گوئی جب کی گئی تو ''زوال روما'' کے مصنف ایڈورڈ گبن کے الفاظ میں:

''کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از وقوع نہیں ہو سکتی تھی، اِس لیے کہ ہرقل کے پہلے بارہ سال رومی سلطنت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔'' لیکن یہ ٹھیک اپنے وقت پر پوری ہو گئی اور مارچ ۶۲۸ میں رومی حکمران اس شان سے قسطنطنیہ واپس آیا کہ اُس کے رتھ کو چار ہاتھی کھینچ رہے تھے اور بے شمار لوگ دار السلطنت کے باہر چراغ اور زیتون کی شاخیں لیے اپنے ہیرو کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

۵۔ نبیوں میں سے جو رسول کے منصب پر فائز ہوتے ہیں، وہ خدا کی عدالت بن کر آتے ہیں اور اپنی قوم کا فیصلہ کر کے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ کے یہ پیغمبر اپنے پروردگار کے میثاق پر قائم رہتے ہیں تو اِس کی جزا اور انحراف کرتے ہیں تو اِس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں مل جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا اُن کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو اُن کی قوموں کے لیے دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو غلبہ عطا فرماتے اور اِن کی دعوت کے منکرین پر اپنا

عذاب نازل کر دیتے ہیں۔

اِن نبیوں کے بارے میں اللہ کا حکم ہے کہ اِن کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنی کتاب میں خود واضح فرما دی ہے کہ نبی صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں، بلکہ اطاعت کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ وہ اِس لیے نہیں آتا کہ لوگ اُس کو نبی اور رسول مان کر فارغ ہو جائیں۔ اُس کی حیثیت صرف ایک واعظ و ناصح کی نہیں، بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے۔ اُس کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں جو ہدایت وہ دے، اُس کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔ پھر یہ اطاعت کوئی رسمی چیز نہیں ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ یہ اتباع کے جذبے سے اور پورے اخلاص، پوری محبت اور انتہائی عقیدت و احترام سے ہونی چاہیے۔

## کتابوں پر ایمان

انسان کی ہدایت کے لیے جس طرح نبی بھیجے گئے، اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ اپنی کتابیں بھی نازل کی ہیں۔ یہ کتابیں اِس لیے نازل کی گئیں کہ خدا کی ہدایت لکھی ہوئی اور خود اُس کے الفاظ میں لوگوں کے پاس موجود رہے تاکہ حق و باطل کے لیے یہ میزان قرار پائے، لوگ اِس کے ذریعے سے اپنے اختلافات کا فیصلہ کر سکیں اور اِس طرح دین کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔

اِس وقت جو مجموعۂ صحائف بائیبل کے نام سے موجود ہے، اُس سے بظاہر یہی معلوم

ہوتا ہے کہ یہ کتابیں کسی نہ کسی صورت میں تمام پیغمبروں کو دی گئیں۔قرآن جس طرح تورات وانجیل کا ذکر کرتا ہے، اُسی طرح صحف ابراہیم کا ذکر بھی کرتا ہے۔ یہ سب کتابیں خدا کی کتابیں ہیں۔ چنانچہ بغیر کسی تفریق کے وہ بالا جمال اِن پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔

اِن میں سے چار کتابیں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں، تورات، زبور، انجیل اور قرآن۔تورات موسیٰ علیہ السلام، زبور داوٗد علیہ السلام اور انجیل مسیح علیہ السلام پر نازل کی گئی۔قرآن خدا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ دنیا کے الہامی لٹریچر میں اب تنہا یہی کتاب ہے جس کے بارے میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ جس طرح دی گئی، بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے بالکل اُسی طرح، اُسی زبان میں اور اُسی ترتیب کے ساتھ اِس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔

## روز جزا پر ایمان

دین جن حقائق کو ماننے کا مطالبہ کرتا ہے، اُن میں روز جزا کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت میں اِسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ تمام شریعت، نیکی اور خیر کی اساس یہی عقیدہ ہے۔ نبوت و رسالت کی بنا اِسی پر قائم ہے۔ نبی اِس لیے نبی ہے کہ وہ اِس نبأ عظیم کی خبر دیتا ہے۔ رسول اِس لیے رسول ہے کہ وہ اِس کا پیغام لے کر آتا ہے۔قرآن اِسی روز جزا کے لیے ایک صحیفۂ انذار و بشارت ہے۔ وہ لوگوں کو بتاتا ہے کہ جس طرح تم سو کر اٹھ جاتے ہو؛ جس طرح

مردہ زمین پر پانی برستا ہے اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے زندہ ہو جاتی ہے؛ جس طرح تم کچھ نہیں ہوتے، مگر ایک قطرۂ آب سے جیتے جاگتے انسان بن جاتے ہو، اِسی طرح ایک دن قبروں سے اٹھا کر زندہ کر دیے جاؤ گے۔ اِس میں تمھارے پروردگار کو ذرا بھی مشکل پیش نہ آئے گی۔ اُس کے مخاطبین اِسے مستبعد سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اِن سڑی ہوئی بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا تو وہ جواب دیتا ہے کہ وہی جس نے پہلی مرتبہ اِنھیں بنایا تھا۔ ایک لفظ بولنا جتنا آسان ہے، اُس کے لیے یہ اتنا ہی آسان ہے۔

اِس کے شواہد، علامات اور احوال و مقامات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

## شواہد

پہلی چیز انسان کے اندر خیر و شر کا شعور ہے۔ یہ اِسی شعور کا نتیجہ ہے کہ اُس کے ضمیر میں ایک نگران ہر وقت اُس کی برائیوں پر اُسے متنبہ کرتا رہتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی عدالت ہے جو انسان کے اندر قائم ہے اور ہر موقع پر اپنا بے لاگ فیصلہ سناتی ہے۔ انسان اِس فیصلے کو مانے یا نہ مانے، وہ فکر و خیال اور علم و عمل کی ہر لغزش کے بعد اِسے سنتا ضرور ہے، یہاں تک کہ اُس کی بدنفسی اِس قدر بڑھ جائے کہ اعمال کی سیاہی اُس کے دل کا احاطہ کر کے اُس کو بالکل اندھا بہرا کر دے۔ یہ انسان کے اوپر خود اُس کے

باطن کی گواہی ہے جسے نفس لوامہ کی شہادت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن اِسے پیش کرتا اور انسان کو بتاتا ہے کہ تم کوئی شترِ بے مہار نہیں ہو کہ جو چاہے کرتے رہو، تم سے کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح یہ قیامتِ صغریٰ خود تمھارے اندر برپا ہے، اِسی طرح پوری کائنات کے لیے بھی ایک قیامت لازماً برپا ہوگی جس میں تم اپنے پروردگار کے حضور میں جواب دہ ٹھیرائے جاؤ گے اور جو کچھ تم نے کیا ہوگا، اُس کے لحاظ سے تمھارے لیے جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا۔ تم اِسے نہیں مانتے تو اپنے آپ کو جھٹلاتے اور اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرتے ہو۔

دوسری چیز انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ عدل کو چاہتا اور ظلم سے نفرت کرتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِس کے باوجود وہ ظلم کرتا ہے۔ لیکن اِس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انسان ظلم اور عدل میں فرق کرنے سے قاصر ہے یا ظلم سے محبت کرتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ جذبات و خواہشات سے مغلوب ہو کر وہ اپنے نفس کا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ انسان دوسروں کے گھر میں نقب لگاتا ہے، مگر کبھی نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا اُس کے گھر میں نقب لگائے؛ دوسروں کو قتل کرتا ہے، مگر کبھی پسند نہیں کرتا کہ کوئی اُس کی یا اُس کے اعزہ و اقربا میں سے کسی کی جان لے؛ دوسروں کے لیے کم تولتا ہے، مگر کم تلوانے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوتا۔ اِنھی چوروں، قاتلوں اور ڈنڈی مارنے والوں سے پوچھیے تو وہ اعتراف کریں گے کہ اِن میں سے ہر چیز ایک جرم ہے اور اِسے ختم ہونا چاہیے۔ لہٰذا کوئی انسان بہ قائمی ہوش و حواس اِس بات پر راضی

نہیں ہو سکتا کہ نیک و بد کو یکساں سمجھا جائے اور دونوں سے ایک ہی معاملہ کیا جائے۔ قرآن یہ حقائق سامنے رکھتا اور منکرین قیامت سے پوچھتا ہے کہ کیا ہم فرماں برداروں اور مجرموں کو برابر کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا حکم لگاتے ہو؟

تیسری چیز انسان اور کائنات، دونوں کی ناتمامی ہے۔ انھیں جس پہلو سے دیکھیے، صاف نظر آتا ہے کہ ایک طرف اِن کے ایک ایک جزو سے اِن کے بنانے والے کی عظیم قدرت اور عظیم حکمت نمایاں ہے۔ ہر چیز میں اتھاہ معنویت، بے نظیر نظم و ترتیب، بے مثال ریاضی اور اقلیدس، غیر معمولی اہتمام اور بے پناہ تخلیقی حسن علم و عقل کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ دوسری طرف بحیثیت مجموعی اِن دونوں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے تو آخری درجے میں مایوس کر دینے والی ناتمامی اور بے مقصدیت سامنے آتی ہے۔ اِس کے بعد دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ اِس کارخانۂ ہستی کو عبث قرار دے کر فیصلہ کیا جائے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، اِس سے زیادہ اِس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ اِس کو ایک روز جزا اور خدا کی اُس ابدی بادشاہی کے ساتھ ملا کر سمجھا جائے جس کی منادی انبیا علیہم السلام نے کی ہے۔ علم و عقل کا فیصلہ کیا ہے؟ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔

چوتھی چیز صفات الٰہی ہیں، جن کے آثار کائنات کے ذرے ذرے میں نمایاں ہیں۔ ربوبیت اور رحمت کی صفات اِن میں بالخصوص قابل توجہ ہیں۔ عالم کے پروردگار کی طرف سے انسان کی پرورش کا جو غیر معمولی اہتمام کیا گیا ہے، اُسے دیکھنے کے بعد

کوئی عاقل کس طرح باور کرسکتا ہے کہ اُس کا خالق اُسے غیر مسئول چھوڑ دے گا اور رحمٰن ورحیم خدا سے یہ توقع کس طرح کی جاسکتی ہے کہ جن لوگوں نے دنیا کو ظلم وعدوان کا گھر بنا دیا ہے، وہ اُنھیں کوئی سزا نہ دے گا؟ قرآن نے اِسی بنا پر جگہ جگہ توجہ دلائی ہے کہ قیامت اللہ تعالیٰ کی رحمت، ربوبیت اور قدرت وحکمت کا تقاضا ہے۔ خدا کو ماننے کے بعد کوئی شخص اِس کا انکار نہیں کرسکتا۔

پانچویں چیز دنیا میں خدا کی دینونت کا ظہور ہے۔ یہ اُن ہستیوں کے وجود سے ہوا ہے جنھیں نبیوں میں سے رسالت کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں غیر معمولی معجزات دیے، روح القدس سے اُن کی تائید کی، پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ اُن کے ذریعے سے اِسی دنیا میں برپا کردی۔ اِس سے مقصود یہ تھا کہ آخرت کا تصور بھی اُسی معیار پر ثابت کردیا جائے جس معیار پر سائنسی حقائق معمل (laboratory) کے تجربات سے ثابت کیے جاتے ہیں۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ کسی کے پاس کوئی عذر اللہ کے حضور میں پیش کرنے کے لیے باقی نہیں رہ سکتا تھا۔

اِس کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ اِن رسولوں نے حق کی دعوت پیش کی، پھر اعلان کیا کہ اپنی قوم کے لیے وہ خدا کی عدالت بن کر آئے ہیں۔ ایمان وعمل کی بنیاد پر جزا و سزا کے جس معاملے کی خبر دی گئی ہے، وہ اُن کی قوم کے ساتھ اِسی دنیا میں ہونے والا ہے۔ طبعی قوانین جس طرح اٹل ہیں اور ہر حال میں نتیجہ خیز ہو جاتے ہیں، خدا کا اخلاقی قانون بھی اُن کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اِسی طریقے سے نتیجہ خیز ہو

جائے گا۔ لہٰذا اُن کی قوم کے جو لوگ اُن کی دعوت قبول کریں گے، وہ دنیا اور آخرت، دونوں میں نجات پائیں گے اور اُن کے مخالفین پر اُنھیں غلبہ حاصل ہوگا۔ اور جو اِس دعوت کو قبول نہیں کریں گے، وہ ذلیل ہوں گے اور اُن پر خدا کا عذاب آجائے گا۔

یہ پیشین گوئی جس وقت اور جس قوم میں بھی کی گئی، اِس سے زیادہ ناممکن الوقوع اور ناقابل یقین کوئی چیز نہیں تھی، مگر یہ ہر مرتبہ پوری ہوئی اور اِس طرح پوری ہوئی کہ لوگوں نے خدا کو عدالت کرتے ہوئے دیکھا اور زمین و آسمان اُس کے جلال سے معمور ہو گئے۔

قرآن نے بتایا ہے کہ آخری مرتبہ یہ دینونت ساتویں صدی عیسوی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے برپا ہوئی۔ انسانی تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ اِس لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ تاریخ کی روشنی میں ہوا ہے۔ چنانچہ اِس کے جزئیات تک بالکل محفوظ اور اِس کے تمام مراحل گویا آنکھوں کے سامنے ہیں جنھیں کوئی شخص جب چاہے، تاریخ کے اوراق کو الٹ کر دیکھ سکتا ہے۔

## علامات

یہ دن کب آئے گا؟ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اِس کا وقت اُسی کے علم میں ہے اور اپنے کسی نبی یا فرشتے کو بھی وہ اِس پر مطلع نہیں کرتا۔ اِس کے آثار و علامات، البتہ قرآن و حدیث اور قدیم صحیفوں میں بیان ہوئے ہیں۔ اِن میں سے بعض عمومی نوعیت کے ہیں اور بعض کی نوعیت متعین واقعات و

حوادث کی ہے۔ پہلی قسم کی علامات میں سے کوئی چیز قرآن میں بیان نہیں ہوئی۔ اِن کا ذکر روایتوں میں ہوا ہے۔ دوسری قسم کی علامتوں میں سے بھی ایک ہی چیز قرآن میں بیان ہوئی ہے اور وہ یاجوج و ماجوج کا خروج ہے۔ لہٰذا یقینی علامت تو یہی ہے۔ اِس کے علاوہ جو علامات بالعموم بتائی جاتی ہیں، اُن میں سے کچھ ظاہر ہو چکی ہیں اور باقی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اُن کی نسبت میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تو لازماً ظاہر ہو جائیں گی۔

## احوال

قیامت کس طرح برپا ہو گی؟ اِس کی تفصیلات قرآن میں کئی مقامات پر بیان ہوئی ہیں۔ زمین و آسمان پر کیا گزرے گی، مہ و آفتاب اور نجوم و کواکب کے ساتھ کیا ہو گا، زمین پر بسنے والی مخلوقات کس صورت حال سے دوچار ہوں گی، لوگ کس طرح قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کے حضور میں جمع ہوں گے، قرآن میں جگہ جگہ اِس کی تصویریں ہیں۔ ادب جاہلی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کا ذوق تشبیہ سے زیادہ تصویر کا رہا ہے۔ قرآن نے اِس کی رعایت کی ہے اور انذار قیامت کے لیے اُس کی ہلچل کا ایسا مرقع کھینچ دیا ہے کہ اُس کا قاری گویا اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے برپا ہوتے دیکھتا ہے۔ اِس سے حوادث کی جو ترتیب سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے:

۱۔ لوگ پورے اطمینان کے ساتھ اپنے کاروبار چلا رہے ہوں گے۔ اُن میں سے

کوئی راستے میں ہوگا، کوئی بازار میں، کوئی مجلس میں اور کوئی اپنے گھر میں۔ کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوگا کہ نظمِ عالم درہم برہم ہونے والا ہے کہ اچانک صور پھونکا جائے گا اور زلزلۂ قیامت برپا ہو جائے گا۔ زمین کی آبادی پر اس کے نتیجے میں جو کچھ گزرے گی، اُس کا نقشہ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کھینچا گیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک کے بعد زلزلے کا دوسرا جھٹکا آئے گا اور زمین کی حالت اُس کشتی کی سی ہو جائے گی جو موجوں کے تھپیڑے کھا کر ڈگمگا رہی ہو تو دل کانپ رہے ہوں گے، نگاہیں خوف زدہ ہوں گی اور لوگ ایسے مدہوش اور متوالے ہو جائیں گے کہ گویا عذابِ الٰہی کی ہولناکی نے سب کو پاگل بنا کر رکھ دیا ہے۔

۲۔ یہی وہ وقت ہے جب نظمِ عالم درہم برہم ہونا شروع ہوگا۔ پوری کائنات میں ایک ایسا زلزلۂ عظیم برپا ہو جائے گا جس سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، سمندر پھوٹ بہیں گے، تمام کہکشائیں اور اجرامِ فلکی اپنی جگہ چھوڑ کر ایک دوسرے میں جا پڑیں گے۔ ہر طرف ایسا اختلال ہوگا کہ خیال اُس کے تصور سے اور الفاظ اُس کے بیان سے قاصر ہوں گے۔ یہ سلسلہ ایک ایسی مدت تک جسے خدا ہی جانتا ہے، جاری رہے گا۔

۳۔ اِس کے بعد وہ مرحلہ شروع ہوگا جسے قرآن میں اعادۂ خلق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِسی اختلال سے بتدریج ایک نیا نظامِ طبیعت وجود میں آئے گا۔ تمام اجرامِ فلکی، زمین، سورج، چاند، تارے اور اربوں ستاروں اور سیاروں سے بنی ہوئی کہکشائیں نئے قوانین اور نئے نوامیس کے ساتھ ایک نئی زمین اور نئے آسمان میں

تبدیل ہو جائیں گی۔ قرآن کا بیان ہے کہ اِس موقع پر ایک مرتبہ پھر نفخ صور ہوگا جس سے تمام لوگ جی اٹھیں گے اور اپنی قبروں سے نکل کر پروردگار عالم کی عدالت میں پیشی کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔

## مقامات

انسان اس دن کی حاضری کے لیے جن مراحل سے گزرتا ہے، اور اِس کے بعد جن مقامات پر ٹھیرایا جائے گا، اُس کی تفصیلات بھی قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ وہ کشاں کشاں اُسی طرف بڑھ رہا ہے۔ اِس سفر کا پہلا مرحلہ موت ہے۔ دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد یہ مرحلہ ہر انسان پر لازماً آتا ہے۔ اِس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ یہ صبح آسکتی ہے، شام آسکتی ہے، انسان اپنی پیدایش سے پہلے اور پیدا ہوتے ہی اِس سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں یہ جس وقت چاہے، آجاتی ہے اور ہر شخص کو چار و نا چار اِس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ اِس کی حقیقت قرآن میں یہ بیان ہوئی ہے کہ انسان کی اصل شخصیت کو، جسے قرآن میں نفس سے تعبیر کیا گیا ہے اور جو اُس کی حیوانی زندگی سے الگ ایک مستقل وجود ہے، اُس کے جسم سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ اِس کے لیے ایک خاص فرشتہ مقرر ہے جس کے ماتحت فرشتوں کا ایک پورا عملہ ہے۔ وہ آکر باقاعدہ اُس کو ٹھیک اُسی طرح وصول کرتا ہے، جس طرح ایک سرکاری امین کسی چیز کو اپنے قبضے میں لیتا ہے۔

اِس موقع پر جو معاملہ انسان کے ساتھ کیا جاتا ہے، اُس کا ذکر بھی قرآن میں ہوا

ہے۔ انبیا علیہم السلام کی طرف سے اتمام حجت کے بعد اُن کے منکرین کی روحیں فرشتے اُنھیں مارتے ہوئے قبض کرتے ہیں اور موت کے وقت ہی بتا دیتے ہیں کہ اُن کے کرتوتوں کی وجہ سے اب اُن کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ دوسری طرف جو لوگ رسولوں پر ایمان لاتے اور کفر و شرک اور ظلم و عدوان کی ہر آلایش سے بالکل پاک ہوتے ہیں، اُنھیں فرشتے سلام بجالاتے اور جنت کی بشارت دیتے ہیں۔

اِس کے بعد وہ مقامات ہیں جنھیں برزخ، محشر، دوزخ اور جنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

برزخ سے مراد وہ حد فاصل ہے، جہاں مرنے والے قیامت تک رہیں گے۔ روایتوں میں قبر کا لفظ مجازاً اِسی عالم کے لیے بولا گیا ہے۔ اِس میں انسان زندہ ہوگا، لیکن یہ زندگی جسم کے بغیر ہوگی اور روح کے شعور، احساس اور مشاہدات و تجربات کی کیفیت اِس میں کم و بیش وہی ہوگی جو خواب کی حالت میں ہوتی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا معاملہ بالکل واضح ہوگا، خواہ وہ درجۂ کمال میں وفاداری کا حق ادا کرنے والے ہوں یا سرکشی اور تکبر سے جھٹلانے والے اور کھلے نافرمان، اُن کے لیے ایک نوعیت کا عذاب و ثواب اِسی عالم سے شروع ہو جائے گا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اُن سے حساب پوچھنے اور اُن کے خیر و شر کا فیصلہ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

اِس سے اگلا مقام محشر ہے۔ دوسری مرتبہ نفخ صور کے بعد تمام انسان اُس میں زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ زندگی روح و جسم کے ساتھ ہوگی۔ قرآن میں اِسی کو

دوسری مرتبہ کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اِس میں انسان کے دنیوی جسم کو ایک ایسے جسم میں تبدیل کر دیا جائے گا جو خدا کی ابدی بادشاہی میں نعمت و قمت کی ہر حالت میں رہنے کے لیے موزوں ہوگا، لیکن ٹھیک اُسی شخصیت کے ساتھ جس کے ساتھ وہ آج زندہ ہے۔

تمام نوع انسانی اُس روز تین گروہوں میں بانٹ دی جائے گی: ایک حق کے لیے سبقت کرنے والے، دوسرے عام صالحین جن کا نامۂ اعمال اُن کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، تیسرے وہ مجرم جن کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے اور پیچھے ہی سے اُن کا نامۂ اعمال اُن کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیا جائے گا۔

یہی موقع ہے، جب حساب ہوگا اور اتمام حجت کے لیے گواہ پیش کیے جائیں گے۔ انبیا علیہم السلام بھی گواہی کے لیے بلائے جائیں گے۔ لوگوں کی زبانیں، ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھیں اور جسم کے رونگٹے تک گواہی دیں گے۔ اِس کے بعد فیصلہ سنایا جائے گا اور لوگ دوزخ اور جنت میں بھیج دیے جائیں گے۔

دوزخ کے بارے میں قرآن کا بیان ہے کہ یہ بدترین جائے قرار ہے۔ اِس میں آگ کا عذاب ہوگا۔ یہ آگ چہروں کو جھلس دے گی، صورتیں بگاڑ دے گی، کھال ادھیڑ دے گی، دلوں تک پہنچے گی۔ مجرموں کے گلے میں طوق اور پاؤں میں زنجیریں ہوں گی، ہر چیز حسرت بن جائے گی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ لوگ اِس میں اللہ تعالیٰ کے جلوے اور اُس کی نگاہ التفات سے محروم ہوں گے، وہ اِن میں سے بعض مجرموں کی

طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔

جنت اِس کے برخلاف صالحین کی اقامت گاہ ہے۔ اِس کی وسعت پوری کائنات کی وسعت ہے۔ یہ عیش دوام کی جگہ ہے، جہاں زندگی کے ساتھ موت، لذت کے ساتھ الم، خوشی کے ساتھ غم، اطمینان کے ساتھ اضطراب، راحت کے ساتھ تکلیف اور نعمت کے ساتھ قمت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اِس کا آرام دائمی ہے، اِس کی لذت بے انتہا ہے، اِس کے شب و روز جاوداں ہیں، اِس کی سلامتی ابدی ہے، اِس کی مسرت غیر فانی ہے، اِس کا جمال لازوال اور کمال بے نہایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے اِس میں وہ کچھ مہیا کیا ہے جسے نہ آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اُس کا خیال کبھی گزرا ہے۔

۲

# اخلاقیات

ایمان کے بعد دین کا اہم ترین مطالبہ تزکیۂ اخلاق ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ انسان خلق اور خالق، دونوں سے متعلق اپنے عمل کو پاکیزہ بنائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے عمل صالح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تمام شریعت اِسی کی فرع ہے۔ تمدن کی تبدیلی کے ساتھ شریعت تو بے شک، تبدیل بھی ہوئی ہے، لیکن ایمان اور عمل صالح اصل دین ہیں، اِن میں کوئی ترمیم و تغیر کبھی نہیں ہوا۔ قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ جو شخص اللہ کے حضور میں آئے اور اُس کے پاس یہ دونوں ہوں، اُس کے لیے جنت ہے اور وہ اُس میں ہمیشہ رہے گا۔

اِس کے ساتھ یہ بات بھی قرآن نے واضح کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سننے کے لیے کان دیے ہیں، بالکل اِسی طرح نیکی اور بدی کو الگ الگ پہچاننے کے لیے ایک حاسۂ اخلاقی بھی عطا فرمایا ہے۔ وہ محض ایک حیوانی اور عقلی وجود ہی نہیں ہے، اِس کے ساتھ ایک اخلاقی وجود بھی ہے۔ اِس

کے معنی یہ ہیں کہ خیر وشر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اُس کے دل و دماغ میں الہام کر دیا گیا ہے۔ یہ امتیاز ایک عالم گیر حقیقت ہے۔ چنانچہ برے سے برا آدمی بھی گناہ کرتا ہے تو پہلے مرحلے میں اُسے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی معاملہ نیکی کا ہے۔ انسان اُس سے محبت کرتا ہے، اُس کے لیے اپنے اندر عزت اور احترام کے جذبات پاتا ہے اور اپنے لیے جب بھی کوئی معاشرت پیدا کرتا ہے، اُس میں حق وانصاف کے لیے لازماً کوئی نظام قائم کرتا ہے۔ یہ اس امتیاز خیر وشر کے فطری ہونے کا ثبوت ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ برائی کے حق میں انسان بعض اوقات بہانے بھی تراش لیتا ہے، لیکن جس وقت تراشتا ہے، اُسی وقت جانتا ہے کہ یہ بہانے وہ اپنی فطرت کے خلاف تراش رہا ہے۔ اِس لیے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اُس کے ساتھ کر بیٹھے تو بغیر کسی تردد کے وہ اُسے برائی ٹھیراتا اور اُس کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔

اِس الہام کی تعبیر میں، البتہ اشخاص، زمانے اور حالات کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہو سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اِس کی گنجایش بھی اُس نے باقی نہیں رہنے دی اور جہاں کسی بڑے اختلاف کا اندیشہ تھا، اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے خیر وشر کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اِن پیغمبروں کی ہدایت اب قیامت تک کے لیے قرآن مجید میں محفوظ ہے۔ انسان اپنے اندر جو کچھ پاتا ہے، یہ ہدایت اُس کی تصدیق کرتی ہے اور انسان کا وجدانی علم، بلکہ تجربی علم، قوانین حیات اور حالات وجود سے

استنباط کیا ہوا علم اور عقلی علم، سب اِس کی گواہی دیتے ہیں۔ چنانچہ اخلاق کے فضائل و رذائل اِس کے نتیجے میں پوری قطعیت کے ساتھ متعین ہو جاتے ہیں۔

## بنیادی اصول

اِس باب میں بنیادی اصول کی حیثیت جس چیز کو حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو عدل و احسان کا اور قرابت مندوں کو دیتے رہنے کا حکم دیتا ہے اور فواحش، منکرات اور سرکشی سے روکتا ہے۔ یہ سب چیزیں، بالکل فطری ہیں، لہٰذا خدا کے دین میں بھی ہمیشہ مسلّم رہی ہیں۔ تورات کے احکام عشرہ اِنھی پر مبنی ہیں اور قرآن نے بھی اپنے تمام اخلاقی احکام میں اِنھی کی تفصیل کی ہے۔ ہم یہاں اِن کی وضاحت کریں گے۔

پہلی چیز عدل ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا جو حق واجب کسی پر عائد ہوتا ہے، اُسے بے کم و کاست اور بے لاگ طریقے سے ادا کر دیا جائے، خواہ صاحب حق کمزور ہو یا طاقت ور اور خواہ ہم اُسے پسند کریں یا ناپسند۔

دوسری چیز احسان ہے۔ یہ عدل سے زائد ایک چیز اور تمام اخلاقیات کا جمال و کمال ہے۔ اِس سے مراد صرف یہ نہیں کہ حق ادا کر دیا جائے، بلکہ مزید براں یہ بھی ہے کہ ہم دوسروں سے باہمی مراعات اور فیاضی کا رویہ اختیار کریں۔ اُن کے حق سے اُنھیں کچھ زیادہ دیں اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جائیں۔ یہی وہ چیز ہے

جس سے معاشرے میں محبت ومودت، ایثار واخلاص، شکر گزاری، عالی ظرفی اور خیر خواہی کی قدریں نشو ونما پاتی اور زندگی میں لطف وحلاوت پیدا کرتی ہیں۔

تیسری چیز قرابت مندوں کے لیے انفاق ہے۔ یہ احسان ہی کی ایک اہم فرع ہے اور اُس کی ایک خاص صورت متعین کرتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرابت مند صرف اِسی کے حق دار نہیں ہیں کہ اُن کے ساتھ عدل واحسان کا رویہ اختیار کیا جائے، بلکہ اِس کے بھی حق دار ہیں کہ لوگ اپنے مال پر اُن کا حق تسلیم کریں، اُنھیں کسی حال میں بھوکا ننگا نہ چھوڑیں اور اپنے بال بچوں کے ساتھ اُن کی ضرورتیں بھی جس حد تک ممکن ہو، فیاضی کے ساتھ پوری کرنے کی کوشش کریں۔

اِن کے مقابلے میں بھی تین ہی چیزیں ہیں جن سے روکا گیا ہے۔

پہلی چیز فواحش ہیں۔ اِن سے مراد زنا، اغلام اور اِن کے متعلقات ہیں۔

دوسری چیز منکرات ہیں۔ یعنی وہ کام جنھیں انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور جن کی برائی ایسی کھلی ہوئی ہے کہ اُس کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مذہب وملت اور تہذیب وتمدن کی ہر اچھی روایت میں اُنھیں برا ہی سمجھا جاتا ہے۔ قرآن نے اِن کے لیے ایک جگہ 'منکر' اور دوسری جگہ 'اثم' کا لفظ استعمال کر کے واضح کر دیا ہے کہ اِن سے مراد وہ کام ہیں جن سے دوسروں کے حقوق تلف ہوتے ہوں۔

تیسری چیز سرکشی ہے۔ یعنی آدمی اپنی قوت، طاقت اور زور واثر سے ناجائز فائدہ

اٹھائے، حدود سے تجاوز کرے اور دوسروں کے حقوق پر، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے، دست درازی کرنے کی کوشش کرے۔

# فضائل و رذائل

اِس اجمال کی شرح قرآن نے اِس طرح فرمائی ہے کہ اخلاق کے فضائل و رذائل بالکل متعین طریقے پر واضح کر دیے ہیں۔ یہ جہاں بیان ہوئے ہیں، وہاں سلسلۂ بیان کی ابتدا بھی شرک کی ممانعت سے ہوتی ہے اور اُس کا خاتمہ بھی اسی کی تاکید پر کیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب کسی چیز کی اہمیت کو نمایاں کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ درمیان میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، اُن کے لیے یہ عقیدہ گویا شہر پناہ ہے جس کے وجود سے شہر قائم رہتا اور جس میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے تو پورا شہر خطرے کی زد میں آ جاتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اخلاق کے فضائل میں توحید کی حیثیت یہی ہے۔ یہ اُس عدل کا سب سے بڑا اور بنیادی تقاضا ہے جس کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ چنانچہ شرک کو اِسی بنا پر ظلم عظیم کہا گیا ہے اور اِس کا یہ نتیجہ بھی قرآن نے پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے جس کی پاداش میں لوگ راندہ اور ملامت زدہ ہو کر جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔

یہ شرک کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو الٰہ بنایا جائے تو قرآن اپنی اصطلاح

میں اُسے شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو خدا کی ذات سے یا خدا کو اُس کی ذات سے سمجھا جائے یا خلق میں یا مخلوقات کی تدبیر امور میں کسی کا کوئی حصہ مانا جائے اور اِس طرح کسی نہ کسی درجے میں اُسے اللہ تعالیٰ کا ہم سر بنا دیا جائے۔

پہلی صورت کی مثال سیدنا مسیح، سیدہ مریم اور فرشتوں کے بارے میں عیسائیوں اور مشرکین عرب کے عقائد ہیں۔ صوفیوں کا عقیدۂ وحدت الوجود بھی اِسی کے قبیل سے ہے۔

دوسری صورت کی مثال ہندووں میں برہما، وشنو، شیو اور مسلمانوں میں غوث، قطب، ابدال، داتا اور غریب نواز جیسی شخصیتوں کا عقیدہ ہے۔ ارواح خبیثہ، نجوم و کواکب اور شیاطین کے تصرفات کو بھی اِسی کے ذیل میں سمجھنا چاہیے۔

اِس کے علاوہ جو احکام اِس باب میں آئے ہیں، اُن کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

## اللہ کی عبادت

پہلا حکم یہ ہے کہ جب اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو پھر عبادت بھی اُسی کی ہونی چاہیے۔ اِس عبادت کے بارے میں ہم اِس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس کی حقیقت خضوع اور تذلل ہے جس کا اولین ظہور پرستش کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر انسان کے عملی وجود کی رعایت سے یہی پرستش اطاعت کو شامل ہو جاتی ہے۔ پہلی صورت کے مظاہر تسبیح و تحمید، دعا و مناجات، رکوع و سجود، نذر، نیاز، قربانی اور اعتکاف ہیں۔ دوسری صورت میں آدمی کسی کے لیے خدائی اختیارات ماننا اور مستقل بالذات

شارع و حاکم کی حیثیت سے اُس کے حکم پر سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اللہ، پروردگار عالم کا فیصلہ ہے کہ اِن میں سے کوئی چیز بھی اُس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کوئی شخص اگر کسی کی تسبیح وتحمید کرتا ہے یا اُس سے دعا و مناجات کرتا ہے یا اُس کے لیے رکوع و سجود کرتا ہے یا اُس کے حضور میں نذر، نیاز یا قربانی پیش کرتا ہے یا اُس کے لیے اعتکاف کرتا ہے یا خدائی اختیارات مان کر اُس کی اطاعت کرتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے اِس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

## والدین سے حسن سلوک

دوسرا حکم یہ ہے کہ والدین سے حسن سلوک کیا جائے۔ اِس کی تعلیم تمام الہامی صحائف میں دی گئی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ انسانوں میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ چنانچہ اللہ کی عبادت کے بعد سب سے پہلے اِسی کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے والدین ہی اُس کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصیحت ماں اور باپ، دونوں کے بارے میں یہ ہے کہ اپنے پروردگار کے بعد انسان کو سب سے بڑھ کر اُنھی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ شکر محض زبان سے ادا نہیں ہوتا۔ اِس کے چند لازمی تقاضے ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔

پہلی بات یہ فرمائی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ آدمی کو اِس طرح پیش آنا چاہیے کہ وہ ظاہر و باطن میں اُن کی عزت کرے، اُن کے خلاف اپنے دل میں کوئی بے زاری نہ پیدا ہونے دے، اُن کے سامنے سوء ادب کا کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالے، بلکہ نرمی،

محبت، شرافت اور سعادت مندی کا اسلوب اختیار کرے۔ اُن کی بات مانے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں میں اُن کی دل داری اور تسلی کرتا رہے۔

دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ والدین کے سامنے اطاعت وفرماں برداری کے بازو ہر حال میں جھکے رہیں اور یہ اطاعت و فرماں برداری تمام تر مہر و محبت اور رحمت و شفقت کے جذبے سے ہونی چاہیے۔ والدین جس طرح بچے کو پرندوں کی طرح اپنے بازوؤں میں چھپا کر رکھتے ہیں، بچوں کو بھی چاہیے کہ اُن کے بڑھاپے میں اِسی طرح اُن کو اپنی محبت واطاعت کے بازوؤں میں چھپا کر رکھیں۔ اِس لیے کہ والدین کی شفقت کا حق اگر کچھ ادا ہوسکتا ہے تو اِسی جذبے سے ہوسکتا ہے۔ اِس کے بغیر یہ حق ادا کرنا کسی شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ اِس کے ساتھ اُن کے لیے برابر دعا کی جائے کہ پروردگار جس طرح اُنھوں نے شفقت ومحبت کے ساتھ بچپن میں ہمیں پالا ہے، اُسی طرح اب بڑھاپے میں آپ اُن پر اپنی رحمت نازل فرمائیں۔ یہ دعا والدین کا حق ہے اور اُس حق کی یاددہانی بھی جو والدین سے متعلق اولاد پر عائد ہوتا ہے۔ پھر یہ اُس جذبۂ محبت کی محرک بھی ہے جس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ نے والدین سے حسن سلوک کے معاملے میں کیا ہے۔

والدین کے علاوہ جو تعلقات اِس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، اُن میں بھی آدمی کا رویہ درجہ بدرجہ یہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ اعزہ واقربا، یتامیٰ ومساکین، پڑوسیوں،

مسافروں اور زیر دستوں کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اِسی بات کی نصیحت فرمائی ہے۔

## اللہ کی راہ میں انفاق

تیسرا حکم یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں انفاق کیا جائے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں انسان کو بخشی ہیں، وہ جس طرح اُنھیں اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے، اُسی طرح اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد اُنھیں دوسرے ابنائے نوع پر بھی خرچ کرے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ کا بندہ بن کر رہنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے: ایک یہ کہ خالق کے ساتھ انسان کا تعلق ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے۔ دوسری یہ کہ مخلوق کے ساتھ وہ صحیح طریقے پر جڑ جائے۔ پہلی چیز نماز سے حاصل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا اولین مظہر ہے اور دوسری انفاق سے جو اُس کی مخلوق کے ساتھ محبت کا اولین مظہر ہے۔ پھر اس کا صلہ بھی خدا کی محبت ہی ہے۔ اِس لیے کہ انسان جو کچھ خرچ کرتا ہے، اُسے درحقیقت آسمان پر جمع کرتا ہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں، اُس کا دل بھی اِس کے نتیجے میں وہیں لگا رہتا ہے۔

یہ انفاق اعزہ واقربا اور یتامیٰ و مساکین کا حق ہے جسے ادا کرنا ضروری ہے۔ اِس میں کوتاہی آدمی کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک غصب حقوق کا مجرم بنا سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے یہ بات ایک جگہ صاف واضح کر دی ہے کہ اِن حقوق سے بے پروا ہو کر اگر کوئی

شخص مال و دولت جمع کرتا ہے تو یہ کنز ہے اور اِس کی سزا جہنم کی آگ ہے جس سے ہر بندۂ مومن کو اپنے پروردگار کی پناہ مانگنی چاہیے۔

اِس انفاق کی توفیق اُنھی لوگوں کو ملتی ہے جو اپنے اخراجات میں اعتدال کا رویہ اختیار کرتے اور اللہ تعالیٰ جو رزق اُنھیں عطا فرماتے ہیں، اُس کو اپنی کسی تدبیر و حکمت کا نہیں، بلکہ اللہ کی عنایت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ دو باتیں مزید فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ مال کو اللے تللے اڑانا جائز نہیں ہے۔ یہ اللہ کی نعمت ہے اور اِس کے بارے میں صحیح رویہ یہ ہے کہ آدمی اعتدال اور کفایت شعاری کے ساتھ اپنی جائز ضرورتوں پر خرچ کرے اور جو کچھ بچائے، اُسے حق داروں کی امانت سمجھے اور اِس امانت کو نہایت احتیاط کے ساتھ ادا کرے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی ضرورتوں کے معاملے میں اعتدال اور توازن کا رویہ اختیار نہیں کرتا، اُسے اپنے ہی شوق پورے کرنے سے فرصت نہیں ملتی کہ دوسروں کے حقوق ادا کر پائے۔ فرمایا کہ جو لوگ اپنا مال اِس طرح اڑاتے ہیں، وہ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ وہ اُنھیں ورغلا کر اپنی راہ پر لگا لیتا ہے اور اُن سے اُن کاموں پر خرچ کراتا ہے جن سے وہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے اُس کی ناراضی لے کر لوٹتے ہیں۔ اِس معاملے میں صحیح نقطۂ اعتدال کی وضاحت اِس طرح کی ہے کہ آدمی نہ اپنے ہاتھ بالکل باندھ لے اور نہ بالکل کھلے ہی چھوڑ دے کہ ضرورت کے وقت درماندہ اور ملامت زدہ ہو کر بیٹھا رہے، بلکہ اعتدال کے ساتھ خرچ کرے اور ہمیشہ کچھ بچا کر

رکھے تاکہ اپنے اور دوسروں کے حقوق بروقت ادا کر سکے۔

دوسری یہ کہ رزق کی تنگی اور کشادگی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کے تحت ہے۔ انسان کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ پوری محنت کے ساتھ اِس کے اسباب پیدا کرے۔ جو لوگ اِس حقیقت کو نہیں سمجھتے، وہ دوسروں پر خرچ کرنا تو الگ رہا، بارہا ایسے سنگ دل ہو جاتے ہیں کہ تنگ دستی کے اندیشے سے اپنی اولاد تک کو قتل کر دیتے ہیں۔ اِس میں خاص طور پر عرب جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی اُس سنگ دلانہ رسم کی طرف اشارہ ہے جس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ عورت چونکہ کوئی کماؤ فرد نہیں ہے، اِس لیے اُس کی پرورش کا بوجھ کیوں اٹھایا جائے۔ فرمایا ہے کہ اُنھیں قتل نہ کرو، اُن کو بھی ہم ہی رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی اور مطمئن رہو کہ اللہ اپنے بندوں کی ہر حالت پر نگران اور اُن کا نگہبان ہے۔ وہ اُن سے بے خبر نہیں ہے۔

## عفت و عصمت

چوتھا حکم یہ ہے کہ کوئی شخص زنا کے قریب نہ جائے۔ اِس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ کھلی بے حیائی اور نہایت برا طریقہ ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اِس کے برائی اور بے حیائی ہونے پر کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کی فطرت اِسے ہمیشہ سے ایک بڑا گناہ اور ایک سنگین جرم سمجھتی رہی ہے اور جب تک وہ بالکل مسخ نہ ہو جائے، اِسی طرح سمجھتی رہے گی۔ انسان سے متعلق یہ حقیقت بالکل ناقابل تردید ہے

کہ خاندان کا ادارہ اُس کے لیے ہوا اور پانی کی طرح ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ یہ ادارہ صحیح فطری جذبات کے ساتھ صرف اُسی صورت میں قائم ہوتا اور قائم رہ سکتا ہے، جب زوجین کا باہمی تعلق مستقل رفاقت کا ہو۔ یہ چیز اگر مفقود ہو جائے تو اِس سے فطری اور روحانی جذبات سے محروم جانوروں کا ایک گلہ تو وجود میں آسکتا ہے، کوئی صالح معاشرہ اور صالح تمدن وجود پذیر نہیں ہوسکتا۔

اِس فعل کی یہی شناعت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے صرف اتنی بات نہیں کہی کہ زنا نہ کرو، بلکہ فرمایا ہے کہ زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی تمام باتوں سے دور رہو جو زنا کی محرک، اُس کی ترغیب دینے والی اور اُس کے قریب لے جانے والی ہوں۔ مرد و زن کے اختلاط کے جو آداب قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ انسان کو اِسی طرح کی چیزوں سے بچانے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ مرد اور عورتیں، دونوں اپنے جسمانی اور نفسیاتی تقاضوں کے لحاظ سے اپنی نگاہوں کو زیادہ سے زیادہ بچا کر اور اپنے جسم میں اندیشے کی جگہوں کو زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھیں اور کوئی ایسی بات نہ کریں جو ایک دوسرے کے صنفی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی ہو۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان جب کسی معاشرے میں زنا کو عام کرنا چاہتا ہے تو اپنی تاخت کی ابتدا بالعموم اِنھی چیزوں سے کرتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم و حوا پر بھی وہ اِسی راستے سے حملہ آور ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے زنا کا چرچا کرنے اور اِس کے لیے ترغیبات پیدا کرنے کی کوشش کو اِسی بنا پر ایک بڑا جرم

قرار دیا ہے۔

## انسانی جان کی حرمت

پانچواں حکم یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو قتل نہ کرے۔ مذہب واخلاق کی رو سے انسانی جان کو جو حرمت ہمیشہ سے حاصل رہی ہے، یہ اُسی کا بیان ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اِس کے بارے میں یہی تاکید اِس سے پہلے بنی اسرائیل کو کی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے یہ بات اُن پر لکھ دی تھی کہ ایک انسان کا قتل درحقیقت پوری انسانیت کا قتل ہے۔

اِس کے ساتھ یہ بات بھی قرآن نے واضح کر دی ہے کہ اِس جرم کے مرتکبین کا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہیں ہے، مقتول کے اولیا کے ساتھ بھی ہے اور اُن کو اللہ نے پورا اختیار دے دیا ہے، لہٰذا دنیا کی کوئی عدالت اُن کی مرضی کے بغیر قاتل کو کوئی رعایت نہیں دے سکتی۔ اُس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اگر قصاص پر اصرار کریں تو اُن کی مدد کرے اور جو کچھ وہ چاہیں، اُسے پوری قوت کے ساتھ اور ٹھیک ٹھیک نافذ کر دے۔

## یتیم کے مال میں خیانت

چھٹا حکم یہ ہے کہ یتیم کے مال میں کوئی ناجائز تصرف نہ کیا جائے۔ اِس حکم کے الفاظ وہی ہیں جو اوپر زنا سے روکنے کے لیے آئے ہیں۔ یعنی یتیم کی بہبود اور بہتری کے ارادے کے سوا اُس کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ یتیم کے مال میں صرف وہی تصرف جائز ہے جو اُس کی حفاظت اور نشو و نما کی غرض سے کیا جائے

اور اُسی وقت تک کیا جائے، جب تک یتیم سن رشد کو پہنچ کر اپنے مال کی ذمہ داری خود
سنبھالنے کے قابل نہیں ہو جاتا۔

## عہد کی پابندی

ساتواں حکم یہ ہے کہ جو عہد بھی کیا جائے، اُسے ہر حال میں پورا کیا جائے۔ فرمایا
ہے کہ اِس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات پر بھی یہ
حکم اِسی تاکید کے ساتھ آیا ہے۔ جہاد و قتال کے موقع پر بھی جو سب سے اہم ہدایت
قرآن میں بیان ہوئی ہے، وہ یہی عہد کی پابندی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور
آپ کے ساتھیوں کو ایک جگہ مشرکین عرب کے ساتھ تمام معاہدات ختم کر کے آخری
اقدام کا حکم دیا گیا ہے، لیکن اتنی بات اُس میں بھی واضح کر دی گئی ہے کہ کوئی معاہدہ
اگر وقت کی قید کے ساتھ کیا گیا ہے تو اُس کی مدت لازماً پوری کی جائے گی۔ ایک
دوسری جگہ مزید وضاحت کی گئی ہے کہ کوئی معاہد قوم اگر مسلمانوں پر ظلم بھی کر رہی ہو تو
معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اُن کی مدد نہیں کی جا سکتی۔

## ناپ تول میں دیانت

آٹھواں حکم یہ ہے کہ ناپ تول میں کمی بیشی نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ
زمین و آسمان کو اُس نے ایک میزان پر قائم کیا ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ انسان بھی
اپنے دائرۂ اختیار میں انصاف پر قائم رہے اور ہمیشہ صحیح پیمانے سے ناپے اور ٹھیک

ترازو سے تولے۔ اِس سے واضح ہے کہ یہ ایک عظیم حکم ہے اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے اُسی میزان انصاف کی فرع ہے جس پر یہ دنیا قائم ہے۔ چنانچہ اِس سے انحراف اگر کوئی شخص کرتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ عدل وقسط کے تصور میں اختلال واقع ہو چکا اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کا عقیدہ باقی نہیں رہا۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ معیشت اور معاشرت کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور تمدن کی کوئی اینٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہتی۔

اشیا میں ملاوٹ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اگر کوئی شخص دودھ میں پانی، شکر میں ریت اور گندم میں جو ملا کر بیچتا ہے تو اِسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اِس لیے کہ پورا تول کر بھی وہ خریدار کو اُس کی خریدی ہوئی چیز پوری نہیں دیتا۔ یہ درحقیقت دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے جس کا نتیجہ دنیا اور آخرت، دونوں میں یقیناً برا ہوگا۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو، اِس لیے کہ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی یہی اچھا ہے۔

## اوہام کی پیروی

نواں حکم یہ ہے کہ جس چیز کا علم نہ ہو، کوئی شخص اُس کے پیچھے نہ لگے۔ قرآن نے متنبہ فرمایا ہے کہ اِسے کوئی معمولی بات نہیں سمجھنا چاہیے، اِس لیے کہ انسان کی سماعت و بصارت اور دل ودماغ، ہر چیز کو ایک دن خدا کے حضور میں جواب دہ ہونا ہے۔ اِس

کے معنی یہ ہیں کہ کسی مسلمان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ بدگمانی کرے یا کسی پر الزام لگائے یا تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی قدم اٹھائے یا محض شبہات پر افواہیں اڑائے یا اپنے پروردگار کی ذات و صفات اور احکام و ہدایات کے بارے میں ظنون و اوہام اور لاطائل قیاسات پر مبنی کوئی نقطۂ نظر اختیار کرے۔

## غرور و تکبر

دسواں حکم یہ ہے کہ خدا کی زمین پر کوئی شخص اکڑ کر نہ چلے، اِس لیے کہ یہ مغروروں اور متکبروں کی چال ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ تم کتنا ہی زمین پر پاؤں مارتے ہوئے چلو، لیکن اِس کو پھاڑ نہیں سکتے اور کتنا ہی اترا کر اور سر اٹھا کر چلو، لیکن پہاڑوں کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے۔

اِس طرح کی چال، ظاہر ہے کہ آدمی کے باطن کی ترجمان ہوتی ہے۔ دولت، اقتدار، حسن، علم، طاقت اور ایسی ہی دوسری جتنی چیزیں آدمی کے اندر غرور پیدا کرتی ہیں، اُن میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اُس کی چال کے ایک مخصوص ٹائپ میں نمایاں ہوتا اور اِس بات پر دلیل بن جاتا ہے کہ اُس کا دل بندگی کے شعور سے خالی ہے اور اُس میں خدا کی عظمت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جس دل میں بندگی کا شعور اور خدا کی عظمت کا تصور ہو، وہ اُنھی لوگوں کے سینے میں دھڑکتا ہے جن پر تواضع اور فروتنی کی حالت طاری رہتی ہے۔ وہ اکڑنے اور اترانے کے بجائے سر جھکا کر چلتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ انسان کا یہ غرور وتکبر صرف اُس کی چال میں ظاہر نہیں ہوتا، اُس کی گفتگو، وضع قطع، لباس اور نشست و برخاست، ہر چیز میں نمایاں ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسی تمام چیزوں کا استعمال ممنوع سمجھنا چاہیے جن سے امارت کی نمائش ہوتی ہو یا وہ بڑائی مارنے، شیخی بگھارنے، دون کی لینے، دوسروں پر رعب جمانے یا اوباشوں کے طریقے پر دھونس دینے والوں کی وضع سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں تک کہ ڈاڑھی اور مونچھیں رکھنے اور لباس پہننے میں بھی کوئی متکبرانہ وضع اختیار نہیں کرنی چاہیے۔

پھر یہی نہیں، انسان کی یہ نفسی کیفیت بعض بڑے بڑے گناہوں کا باعث بھی بنتی ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ حق کو حق سمجھتے ہوئے اُس کی تکذیب کر دینے، رنگ ونسل اور حسب ونسب کے اعتبار سے اپنے آپ کو برتر سمجھنے، دوسروں کو حقیر سمجھ کر اُن کا مذاق اڑانے، اُن پر طعن کرنے، برے القاب دینے اور پیٹھ پیچھے اُن کے عیب اچھالنے جیسے گناہوں کا محرک انسان کا یہی پندارِ نفس اور غرور وتکبر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِن سب چیزوں سے بھی نہایت سختی کے ساتھ روکا ہے۔

تورات کے احکام کی طرح یہ قرآن کے احکام عشرہ ہیں۔ تمام اخلاقیات اِنھی دس احکام کی فرع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن گناہوں کو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے تعبیر کیا ہے، وہ اِنھی احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ اِس خلاف ورزی کی سزا لوگوں کو قیامت میں بھگتنا پڑ سکتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان اس معاملے میں متنبہ رہے۔

اِس کے لیے یہ تین باتیں پیش نظر رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ اِن میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی اگر نادانستہ ہوئی ہے تو اللہ اُس پر گرفت کرنے والا نہیں ہے۔ اُس کا قانون یہ ہے کہ اگر بلا ارادہ کوئی ایسی بات ہو جائے جو بظاہر تو ایک ممنوع فعل ہو، مگر اُس میں درحقیقت اُس ممنوع فعل کی نیت نہ ہو تو اُس پر وہ کوئی مواخذہ نہ کرے گا۔

دوسری یہ کہ اِن احکام کی خلاف ورزی سے کوئی شخص اگر اپنے آپ کو بچائے رکھتا ہے تو اِس کا صلہ یہ ہے کہ اُس کے چھوٹے گناہوں کو اللہ تعالیٰ اپنی بے پایاں رحمت سے معاف فرمادیں گے، ورنہ چھوٹے اور بڑے، سب گناہ اُس کے اعمال نامے میں درج ہوں گے اور اُسے اُن کا حساب دینا پڑے گا۔

تیسری یہ کہ جذبات سے مغلوب ہو کر اگر کوئی شخص اِن میں سے کسی حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھتا ہے تو اُسے توبہ کر کے اپنے رویے کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو، توبہ کر لی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح کر دیا ہے کہ اُس کے اوپر صرف اُنھی لوگوں کی توبہ کا حق قائم ہوتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں، پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ اُن لوگوں کی توبہ اللہ کے نزدیک کوئی توبہ نہیں ہے جو زندگی بھر گناہوں میں ڈوبے رہتے اور جب دیکھتے ہیں کہ موت سر پر آن کھڑی ہوئی ہے تو توبہ کا وظیفہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اِسی طرح جانتے بوجھتے حق کا انکار کر دینے والوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے، اگر وہ موت کے وقت تک

اِس انکار پر قائم رہے ہوں۔

توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کی یہ دو صورتیں قرآن نے متعین کر دی ہیں۔ اِس کے بعد صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی شخص گناہ کے بعد جلد ہی توبہ کر لینے کی سعادت تو حاصل نہیں کر سکا، لیکن اُس نے اتنی دیر بھی نہیں کی کہ موت کا وقت آن پہنچا ہو۔ اِس صورت کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ یہ خاموشی جس طرح امید پیدا کرتی ہے، اِسی طرح خوف بھی پیدا کرتی ہے اور قرآن کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ خوف و رجا کے درمیان ہی رہے۔ اِسی طرح کے لوگ ہیں جن کے بارے میں شفاعت کی امید کی جا سکتی ہے۔

# جمال و کمال

انسان کے اخلاقی وجود کا حسن جب خلق اور خالق، دونوں کے معاملے میں درجۂ کمال کو پہنچتا ہے تو اُس سے جو اوصاف پیدا ہوتے ہیں یا قرآن کی رو سے ہونے چاہییں، وہ بھی اللہ تعالیٰ نے ایک ہی جگہ بیان کر دیے ہیں۔ یہ دس چیزیں ہیں اور پورے قرآن میں اِن پر کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ دین کا جمال و کمال قرآن کے نزدیک یہی ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو اِسی تک پہنچنے اور اِسی کو پانے کی دعوت دیتا ہے۔

یہ اوصاف درج ذیل ہیں:

## اسلام

پہلی چیز اسلام ہے۔ یہ جب اِس طریقے سے ایمان کے ساتھ آتا ہے، جس طرح یہاں آیا ہے تو اِس سے دین کا ظاہر مراد ہوتا ہے۔ یعنی وہ ہدایت جو انسان کے قول و فعل اور اعضا و جوارح سے متعلق ہے۔ چنانچہ آدمی کی زبان اگر اللہ و رسول کے حکم پر کھلنے اور بند ہو جانے کے لیے آمادہ ہے، اُس کی آنکھیں اگر اُن کے ایما سے دیکھنے اور جھک جانے کے لیے تیار ہیں، اُس کے کان اگر اُن کی ہدایت پر سننے اور سننے سے انکار کر دینے کے لیے مستعد ہیں، اُس کے ہاتھ اگر اُن کے ارشاد سے اٹھنے اور گر جانے کے منتظر ہیں اور اُس کے پاؤں اگر اُن کے فرمان پر چلنے اور رک جانے سے گریز نہیں کرتے تو یہی اسلام ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کا بہترین نمونہ بھی انبیا علیہم السلام ہی ہیں۔ لہٰذا ہدایت کی گئی ہے کہ تسلیم و رضا کے اِس مرتبے تک پہنچنے کے لیے لوگ اُن ہستیوں کی اتباع کریں جنھیں اللہ نے اُن کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔

## ایمان

دوسری چیز ایمان ہے۔ یہ دین کا باطن ہے اور یہاں اِس سے مراد وہ یقین ہے جو اللہ تعالیٰ اور اُس کے دعووں کے بارے میں اُس کی حقیقی معرفت کے ساتھ پایا جائے۔ چنانچہ جو خدا کو اِس طرح مانے کہ تسلیم و رضا کے بالکل آخری درجے میں

اپنے دل ودماغ کو اُس کے حوالے کردے، قرآن کی اصطلاح میں وہ مومن ہے۔ دل کو طہارت، عقل کو روشنی اور ارادوں کو پاکیزگی اِسی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی ایمان ہے جو علم وعمل، دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا اور انسان کے پورے وجود پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ کے ذکر اور اُس کی آیتوں کی تلاوت اور انفس وآفاق میں اِن آیتوں کے ظہور سے اُس میں افزونی ہوتی ہے۔ اِس کا تقاضا قرآن میں یہ بیان ہوا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی اِس کے حاملین کو اللہ ورسول سے زیادہ محبوب نہیں ہونی چاہیے۔

## قنوت

تیسری چیز قنوت ہے۔ یہ وہ قلبی کیفیت ہے جو انسان کو پورے اخلاص اور یک سوئی کے ساتھ دائماً اپنے پروردگار کی اطاعت پر قائم رکھتی ہے۔ بندۂ مومن کے نہاں خانۂ وجود میں عبد ومعبود کے تعلق کا سب سے نمایاں ظہور یہی ہے۔ چنانچہ قانتین وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ بندگی میں رہیں۔ غم، خوشی، جوش، ہیجان اور لذت والم کی کسی حالت میں بھی اپنے خالق سے سرکش نہ ہوں۔ شہوت کا زور، جذبات کی یورش اور خواہشوں کا ہجوم بھی اُنھیں خدا کے سامنے کبھی بے ادب نہ ہونے دے۔ اُن کا دل خدا کا عرش ہو اور اُس کی شریعت کو وہ حضوری میں دیا گیا حکم سمجھیں جس سے سرتابی کا تصور بھی دربار میں کھڑا ہوا کوئی شخص نہیں کرسکتا۔ یہ، اگر غور کیجیے تو وہی کیفیت ہے جس کا اظہار یہ پورا عالم اور اِس کی تمام مخلوقات زبانِ حال سے کر رہی ہیں۔

## صدق

چوتھی چیز صدق ہے۔ یہ قول و فعل اور ارادہ، تینوں کی مطابقت اور استواری کی تعبیر کے لیے آتا ہے۔ آدمی کے منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، اُس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ ہو اور وہ اپنی ہر بات کو نباہ دے تو یہ زبان اور عمل کی سچائی ہے، لیکن اِس کے ساتھ نیت اور ارادے کی سچائی بھی لازماً شامل ہونی چاہیے۔ قرآن نے اِس کے ضد کردار کو نفاق اور اِسے اخلاص سے تعبیر کیا ہے، پھر جگہ جگہ وضاحت فرمائی ہے کہ خدا کے نزدیک عمل کا اصلی پیکر وہی ہے جو کارگاہ قلب میں تیار کیا جائے۔ لہٰذا صدق کا درجۂ کمال قول و فعل اور ارادے کی اِسی مطابقت سے حاصل ہوتا ہے۔

## صبر

پانچویں چیز صبر ہے۔ یہ اپنے ابتدائی مفہوم میں نفس کو اضطراب اور بے چینی سے روکنے کے لیے آتا ہے۔ پھر اِس سے مشکلات اور موانع کے علی الرغم پامردی، استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے موقف پر جمے رہنے کے معنی اس میں پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جسے بے بسی اور درماندگی کی حالت میں مجبوراً اختیار کیا جائے، بلکہ عزم و ہمت کا سرچشمہ اور تمام سیرت و کردار کا جمال و کمال ہے۔ اِسی سے انسان میں یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے ناخوشگوار تجربات

پر شکایت یا فریاد کرنے کے بجاے وہ اُنھیں رضامندی کے ساتھ قبول کرلے اور خدا کی طرف سے مان کر اُن کا استقبال کرے، نتیجۂ عمل میں تاخیر سے پریشان نہ ہو، اضطراب اور بے چینی سے بچا رہے، برائی کرنے والوں کے لیے بھی اپنے دل میں انتقام کا کوئی جذبہ نہ پیدا ہونے دے، حق کی مدافعت کا موقع ہو تو موت کو سامنے دیکھ کر بھی ثابت قدم رہے، رنج وراحت کی ہر حالت میں ضبطِ نفس سے کام لے اور جس چیز کو فرض وواجب سمجھے، تمام عمر اُس کی پابندی کرتا رہے۔

انسان کی سیرت کا یہی پہلو ہے جس سے خدا اور بندے کے درمیان وہ تعلق قائم ہوتا ہے جسے توکل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ہر حال میں خدا ہی پر بھروسا کیا جائے۔ 'اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ' اِسی تفویض اور سپردگی کا کلمہ ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ اُن لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے خاص الطاف وعنایات ہیں جو اِس کلمے پر قائم رہتے اور اِسی پر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

## خشوع

چھٹی چیز خشوع ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور اُس کی عظمت وجلال کے صحیح تصور سے جو تواضع، عجز اور فروتنی انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے، قرآن اِسے خشوع سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ ایک قلبی کیفیت ہے جو اُسے خدا کے سامنے بھی جھکاتی ہے اور دوسرے انسانوں کے لیے بھی اُس کے دل میں رحمت ورأفت کے جذبات پیدا کردیتی ہے۔

پہلی صورت میں اِس کا بہترین اظہار نماز، بالخصوص شب کی نمازوں میں ہوتا ہے، جب بندۂ مومن دنیا کی سب چیزوں سے الگ ہو کر تنہا اپنے پروردگار سے سرگوشیاں کرتا اور اپنی تنہائیوں کو اُس کے ذکر و شکر سے معمور کر دیتا ہے۔

دوسری صورت میں یہ کیفیت بندۂ مومن کی پوری شخصیت پر اثر انداز ہوتی اور اُسے اپنے اہل و عیال کے لیے سراپا شفقت، اپنے دوستوں، پڑوسیوں اور ملنے والوں کے لیے سراسر رحمت اور اپنے معاشرے کے لیے ایک سرچشمۂ ہدایت بنا دیتی ہے۔ چنانچہ ایسے ہی حلیم اور مہربان انسانوں سے وہ تمدن وجود میں آتا ہے جو زمین پر خدا کی جنت اور ہر سلیم الفطرت انسان کا مطمحِ نظر اور اُس کی آرزوؤں کا محور ہوتا ہے۔

## صدقہ

ساتویں چیز صدقہ ہے۔ اللہ کی راہ میں انفاق کا ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مال میں سے فرض زکوٰۃ ادا کرتا رہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں سے زیادہ جو کچھ ہو، اُسے معاشرے کا حق سمجھے اور جب کوئی مطالبہ سامنے آئے تو اُسے فراخ دلی کے ساتھ پورا کر دے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کو دبا کر اور اپنی ضرورتوں میں ایثار کر کے بھی وہ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرے۔ صدقہ دینے والوں کی تعبیر اِن سب صورتوں کو شامل ہو سکتی ہے، لیکن بیان اوصاف کے موقع پر جب یہ تعبیر اختیار کی جائے گی تو اِس سے اشارہ اصلاً اُس

کے درجۂ کمال ہی کی طرف ہوگا۔ یعنی جوسخی اور فیاض ہواور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دے۔ بندوں کے تعلق سے یہ اُسی خشوع کا اظہار ہے جو اِس سے پہلے مذکور ہے۔ نماز اور انفاق کا ذکر قرآن میں اِسی بنا پر ساتھ ساتھ آتا ہے۔

## روزہ

آٹھویں چیز روزہ ہے۔ یہ ضبط نفس اور تربیت صبر کی خاص عبادت ہے۔ قرآن میں اس کا مقصد یہ بیان ہوا ہے کہ اِس سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ روزہ رکھنے والوں کی تعبیر جب بیان اوصاف کے موقع پر آئے گی، تو اِس سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو تقویٰ کے ایسے حریص ہیں کہ اِس کے لیے زیادہ تر روزے سے رہتے ہیں۔ اِس سے یہ بات آپ سے آپ معلوم ہوئی کہ وہ منکرات سے بچتے، فواحش سے اجتناب کرتے اور اپنی زندگی میں تمام اخلاق عالیہ کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔

## حفظ فروج

نویں چیز حفظ فروج ہے۔ یعنی جو شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ ضبط نفس اور تقویٰ کا ثمرہ ہے۔ برہنگی، عریانی اور فواحش سے اجتناب کرنے والوں کے لیے یہ تعبیر قرآن میں کئی جگہ آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی عفت وعصمت کی بالکل آخری

درجے میں حفاظت کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے جہاں اجازت دی ہے، اُس کے سوا خلوت وجلوت میں اپنا ستر وہ کسی کے سامنے نہیں کھولتے اور نہ کوئی ایسا لباس کبھی پہنتے ہیں جو اُن اعضا کو نمایاں کرنے والا ہو جو اپنے اندر کسی بھی لحاظ سے جنسی کشش رکھتے ہیں۔ فواحش سے اجتناب کا یہی درجہ ہے جس سے وہ تہذیب پیدا ہوتی ہے جس میں حیا فرماں روائی کرتی اور مرد وعورت، دونوں اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ کھولنے کے بجائے، جہاں تک ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھنے کے لیے مضطرب ہوتے ہیں۔

## ذکر کثیر

دسویں چیز ذکر کثیر ہے۔ یعنی اللہ کو بہت زیادہ یاد کیا جائے۔ بندۂ مومن کے دل میں جب اپنے پروردگار کا خیال پوری طرح بس جاتا ہے تو پھر وہ مقررہ اوقات میں کوئی عبادت کر لینے ہی کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ ہمہ وقت اپنی زبان کو خدا کے ذکر سے تر رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی دیکھتا ہے تو 'سبحان اللّٰہ' کہتا ہے۔ کسی کام کی ابتدا کرتا ہے تو 'بسم اللّٰہ' سے کرتا ہے۔ کوئی نعمت پاتا ہے تو 'ألحمد للّٰہ' کہہ کر خدا کا شکر بجالاتا ہے۔ 'إن شاء اللّٰہ' اور 'ماشاء اللّٰہ' کے بغیر اپنے کسی ارادے اور کسی عزم کا اظہار نہیں کرتا، اپنے ہر معاملے میں اللہ سے مدد چاہتا ہے۔ ہر آفت آنے پر اُس کی رحمت کا طلب گار رہتا ہے۔ ہر مشکل میں

اُس سے رجوع کرتا ہے۔ سوتا ہے تو اُس کو یاد کر کے سوتا ہے اور اٹھتا ہے تو اُس کا نام لیتے ہوئے اٹھتا ہے۔ غرض ہر موقع پر اور ہر معاملے میں اُس کی زبان پر اللہ ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ پھر یہی نہیں، وہ نماز پڑھتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، روزہ رکھتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، انفاق کرتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، برائی سے بچتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے، اُس کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اللہ کو یاد کرتا ہے اور فوراً اُس سے رجوع کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ اِس ذکر کی ایک صورت فکر بھی ہے۔ خدا کی اِس دنیا کو دیکھیے تو اِس میں ہزاروں مخلوقات ہیں، اُن کی رنگا رنگی اور بوقلمونی ہے، پھر عقل انسانی اور اُس کے کرشمے ہیں، سمندروں کا تلاطم ہے، دریاؤں کی روانی ہے، لہلہاتا سبزہ اور آسمان سے برستا ہوا پانی ہے، لیل و نہار کی گردش ہے، ہوا اور بادلوں کے تصرفات ہیں، زمین و آسمان کی خلقت اور اُن کی حیرت انگیز ساخت ہے، اُن کی نفع رسانی اور فیض بخشی ہے، اُن کی مقصدیت اور حکمت ہے، پھر انفس و آفاق میں خدا کی وہ نشانیاں ہیں جو ہر آن نئی شان سے نمودار ہوتی ہیں۔ بندۂ مومن اِن آیات الٰہی پر غور کرتا ہے تو اُس کے دل و دماغ کو یہ خدا کی یاد سے بھر دیتی ہیں۔ چنانچہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ پروردگار، یہ کارخانہ تو نے عبث نہیں بنایا۔ تیری شان علم و حکمت کے منافی ہے کہ تو کوئی بے مقصد کام کرے۔ میں جانتا ہوں کہ اِس جہان رنگ و بو کا

خاتمہ لازماً ایک روز جزا پر ہوگا جس میں وہ لوگ عذاب اور رسوائی سے دوچار ہوں گے جو تیری اِس دنیا کو کسی کھلنڈرے کا کھیل سمجھ کر اِس میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُن کے انجام سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔

حصہ دوم

# الکتاب

۱

# قانون عبادات

دین کا مقصد تزکیہ ہے۔ اِس کے منتہاے کمال تک پہنچنے کا ذریعہ اللہ اور بندے کے درمیان عبد و معبود کے تعلق کا اُس کے صحیح طریقے سے قائم ہو جانا ہے۔ یہ تعلق جتنا محکم ہوتا ہے، انسان اپنے علم و عمل کی پاکیزگی میں اتنا ہی ترقی کرتا ہے۔ محبت، خوف، اخلاص و وفا اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں اور بے نہایت احسانات کے لیے احساس و اعتراف کے جذبات، یہ اِس تعلق کے باطنی مظاہر ہیں۔ انسان کے شب و روز میں اِس کا ظہور بالعموم تین ہی صورتوں میں ہوتا ہے: پرستش، اطاعت اور حمیت و حمایت۔ انبیا علیہم السلام کے دین میں عبادات اِسی تعلق کی یاددہانی کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ پرستش ہے۔ قربانی اور عمرہ کی حقیقت بھی یہی ہے۔ روزہ و اعتکاف اطاعت اور حج اللہ تعالیٰ کے لیے حمیت و حمایت کا علامتی اظہار ہے۔

# نماز

اِن میں اہم ترین عبادت نماز ہے۔ دین کی حقیقت، اگر غور کیجیے تو معبود کی معرفت اور اُس کے حضور میں خوف و محبت کے جذبات کے ساتھ خضوع و تذلل ہی ہے۔ اِس حقیقت کا سب سے نمایاں ظہور پرستش ہے۔ تسبیح وتحمید، دعا و مناجات اور رکوع و سجود اِس پرستش کی عملی صورتیں ہیں۔ نماز یہی ہے اور اِن سب کو غایت درجہ حسن توازن کے ساتھ اپنے اندر جمع کر لیتی ہے۔

دین میں اِس عبادت کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ ایمانیات میں جو حیثیت توحید کی ہے، وہی اعمال میں نماز کی ہے۔ یہ خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے لیے فرض کی گئی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات الٰہی کی تذکیر سے خدا کی جو معرفت حاصل ہوتی ہے اور اُس سے اللہ تعالیٰ کے لیے محبت اور شکر گزاری کے جو جذبات انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں یا ہونے چاہییں، اُن کا پہلا ثمرہ یہی نماز ہے۔ یہ اسلام کا ستون ہے، دنیا اور آخرت میں آدمی کے مسلمان سمجھے جانے کی شرائط میں سے ہے، دین پر قائم رہنے کا ذریعہ ہے، مشکل کشا ہے، گناہوں کو مٹاتی ہے، دعوت حق کی پہچان ہے، راہ حق میں استقامت کی بنیاد ہے، کائنات کی فطرت ہے، حقیقی زندگی ہے۔ خدا کی معرفت، اُس کا ذکر و فکر اور اُس کی قربت کا احساس جب منتہاے کمال کو پہنچتا ہے تو نماز بن جاتا ہے۔ دنیا کے سب عارفوں کا فیصلہ ہے کہ اصل زندگی دل کی زندگی ہے اور دل کی

زندگی یہی معرفت، ذکر و فکر اور قربت الٰہی ہے۔ یہ زندگی انسان کو صرف نماز سے حاصل ہوتی ہے اور نماز ہی سے باقی رہتی ہے۔

## نماز کی تاریخ

اِس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے، جتنی خود مذہب کی ہے۔ اِس کا تصور تمام مذاہب میں رہا ہے اور اِس کے مراسم اور اوقات بھی کم و بیش متعین رہے ہیں۔ ہندوؤں کے بھجن، پارسیوں کے زمزمے، عیسائیوں کی دعائیں اور یہودیوں کے مزامیر، سب اِسی کی یادگاریں ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبروں نے اِس کی تعلیم دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس دین ابراہیمی کی تجدید کے لیے ہوئی، اُس میں بھی اِس کی حیثیت سب سے نمایاں ہے۔ قرآن نے جب لوگوں کو اِس کا حکم دیا تو یہ اُن کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ وہ اِس کے آداب و شرائط اور اعمال و اذکار سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ اِس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ قرآن اِس کی تفصیلات بیان کرتا۔ دین ابراہیمی کی ایک روایت کی حیثیت سے یہ جس طرح ادا کی جاتی تھی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے حکم پر بعض ترامیم کے ساتھ اِسے ہی اپنے ماننے والوں کے لیے جاری فرمایا اور نسل در نسل، وہ اُسی طرح اِسے ادا کر رہے ہیں۔

## نماز کے شرائط

نماز کے لیے جن چیزوں کا اہتمام ضروری ہے، وہ یہ ہیں:

نماز پڑھنے والا نشے میں نہ ہو،

وہ اگر عورت ہے تو حیض ونفاس کی حالت میں نہ ہو،

وہ باوضو ہو اور حیض ونفاس یا جنابت کے بعد اُس نے غسل کر لیا ہو،

سفر، مرض یا پانی کی نایابی کی صورت میں، یہ دونوں مشکل ہو جائیں تو وہ تیمم کر لے،

قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز کے لیے کھڑا ہو۔

وضو کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے منہ دھویا جائے، پھر کہنیوں تک ہاتھ دھوئے جائیں، پھر پورے سر کا مسح کیا جائے اور اِس کے بعد پاؤں دھو لیے جائیں۔

وضو اگر ایک مرتبہ کر لیا جائے تو اُس وقت تک قائم رہتا ہے، جب تک کوئی ناقض حالت آدمی کو پیش نہ آ جائے۔ چنانچہ وضو کی یہ ہدایت اُس حالت کے لیے ہے، جب وضو باقی نہ رہا ہو، اِلّا یہ کہ کوئی شخص نشاط خاطر کے لیے تازہ وضو کر لے۔

اِس کے نواقض درج ذیل ہیں:

۱۔ پیشاب کرنا۔

۲۔ پاخانہ کرنا۔

۳۔ ریح کا خارج ہونا، خواہ آواز سے ہو یا آہستہ۔

۴۔ مذی یا ودی کا خارج ہونا۔

سفر، مرض یا پانی کی نایابی کی صورت میں وضو اور غسل، دونوں مشکل ہو جائیں تو

اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ آدمی تیمّم کر سکتا ہے۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی پاک جگہ دیکھ کر اُس سے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لیا جائے۔ یہ ہر قسم کی نجاست میں کفایت کرتا ہے۔ وضو کے نواقض میں سے کوئی چیز پیش آجائے تو اِس کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے اور مباشرت کے بعد غسل جنابت کی جگہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ مرض اور سفر کی حالت میں پانی موجود ہوتے ہوئے بھی آدمی تیمّم کر سکتا ہے۔

اِس سے بظاہر کوئی پاکیزگی تو حاصل نہیں ہوتی، لیکن اگر غور کیجیے تو اصل طریقۂ طہارت کی یادداشت ذہن میں قائم رکھنے کے پہلو سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔ شریعت میں یہ چیز بالعموم ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جب اصلی صورت میں کسی حکم پر عمل کرنا ممکن نہ ہو یا بہت مشکل ہو جائے تو شبہی صورت میں اُس کی یادگار باقی رکھی جائے۔ اِس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حالات معمول پر آتے ہی طبیعت اصلی صورت کی طرف پلٹنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

## نماز کے اعمال

نماز کے لیے جو اعمال مقرر کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

نماز کی ابتدا رفع یدین سے، یعنی دونوں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا کر کی جائے،

قیام کیا جائے،

پھر رکوع کیا جائے،

پھر آدمی قومہ کے لیے کھڑا ہو،

پھر یکے بعد دیگرے دو سجدے کیے جائیں،

ہر نماز کی دوسری اور آخری رکعت میں نماز پڑھنے والا دوزانو ہو کر قعدے کے لیے بیٹھے،

نماز ختم کرنا پیش نظر ہو تو قعدے کی حالت میں منہ پھیر کر نماز ختم کر دی جائے۔

## نماز کے اذکار

نماز کے اذکار درج ذیل ہیں:

نماز شروع کرتے ہوئے 'اَللّٰهُ اَكْبَرُ' کہا جائے،

قیام میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کی جائے، پھر اپنی سہولت کے مطابق باقی قرآن کے کچھ حصے کی تلاوت کی جائے،

رکوع میں جاتے ہوئے 'اَللّٰهُ اَكْبَرُ' کہا جائے،

رکوع سے اٹھتے ہوئے 'سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ' کہا جائے،

سجدوں میں جاتے اور اُن سے اٹھتے ہوئے 'اَللّٰهُ اَكْبَرُ' کہا جائے،

قعدے سے قیام کے لیے اٹھتے ہوئے بھی 'اَللّٰهُ اَكْبَرُ' کہا جائے،

نماز ختم کرنے کے لیے 'اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ' کہا جائے۔

'اَللّٰهُ اَكْبَرُ' (اللہ سب سے بڑا ہے)، 'سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ' (اللہ نے اُس کی بات سن لی جس نے اُس کی حمد کی) اور 'اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ' (تم پر

سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو) امام ہمیشہ بالجہر، یعنی بلند آواز سے کہے گا۔ مغرب اور عشا کی پہلی دو رکعتوں میں، اور فجر، جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں قراءت بھی بلند آواز سے کی جائے گی۔ مغرب کی تیسری اور عشا کی تیسری اور چوتھی رکعت میں یہ ہمیشہ سری ہوگی۔ ظہر اور عصر کی نمازوں میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ اِن کی چاروں رکعتوں میں قراءت سری ہوگی۔

نماز کے لیے شریعت کے مقرر کردہ اذکار یہی ہیں اور اِن کی زبان عربی ہے، اِن کے علاوہ نماز پڑھنے والا جس زبان میں چاہے، تسبیح وتحمید اور دعاو مناجات کی نوعیت کا کوئی ذکر اپنی نماز میں کر سکتا ہے۔

## نماز کے اوقات

نماز ہر مسلمان پر شب و روز میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے۔ یہ اوقات درج ذیل ہیں:

فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا۔

صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ ہو جائے تو یہ فجر ہے۔

ظہر سورج کے نصف النہار سے ڈھلنے کا وقت ہے۔

سورج مرأی العین سے نیچے آجائے تو یہ عصر ہے۔

سورج کے غروب ہو جانے کا وقت مغرب ہے۔

شفق کی سرخی ختم ہو جائے تو یہ عشا ہے۔

فجر کا وقت طلوع آفتاب تک، ظہر کا عصر، عصر کا مغرب، مغرب کا عشا اور عشا کا وقت آدھی رات تک ہے۔ سورج کے طلوع و غروب کے وقت چونکہ اُس کی عبادت کی جاتی تھی، اِس لیے یہ دونوں وقت نماز کے لیے ممنوع قرار دیے گئے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کے دین میں نماز کے اوقات ہمیشہ یہی رہے ہیں۔

## نماز کی رکعتیں

نماز کے لیے جو رکعتیں مقرر کی گئی ہیں، وہ یہ ہیں:

فجر: ۲ رکعت

ظہر: ۴ رکعت

عصر: ۴ رکعت

مغرب: ۳ رکعت

عشا: ۴ رکعت

نماز کی فرض رکعتیں یہی ہیں جن کے چھوڑنے پر قیامت میں مواخذہ ہوگا۔ چنانچہ اُن صورتوں کے سوا جن میں قصر کی اجازت دی گئی ہے، یہ لازماً پڑھی جائیں گی۔ اِن کے علاوہ باقی سب نمازیں نفل ہیں جن کا پڑھنا باعث اجر ہے، لیکن اُن کے چھوڑ دینے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی مواخذے کا اندیشہ نہیں ہے۔

## نماز میں رعایت

نماز کا وقت کسی خطرے، پریشانی، افراتفری اور آپا دھاپی کی حالت میں آ جائے تو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ پیدل چلتے ہوئے یا سواری پر، جس طرح ممکن ہو، نماز پڑھ لی جائے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ جماعت کا اہتمام نہیں ہوگا، قبلہ رو ہونے کی پابندی بھی برقرار نہ رہے گی اور نماز کے اعمال بھی بعض صورتوں میں اُن کے لیے مقرر کردہ طریقے پر ادا نہ ہو سکیں گے۔

اِس طرح کی صورت حال کسی سفر میں پیش آ جائے تو قرآن نے مزید فرمایا ہے کہ لوگ نماز میں کمی بھی کر سکتے ہیں۔ اصطلاح میں اِسے قصر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے لیے یہ سنت قائم کی ہے کہ صرف چار رکعت والی نمازیں دو رکعت پڑھی جائیں گی۔ دو اور تین رکعت والی نمازوں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ چنانچہ فجر اور مغرب کی نمازیں اِس طرح کے موقعوں پر بھی پوری پڑھیں گے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فجر پہلے ہی دو رکعت ہے اور مغرب دن کے وتر ہیں، اِن کی یہ حیثیت تبدیل نہیں ہو سکتی۔

نماز میں تخفیف کی اِس اجازت سے اِس کے اوقات میں تخفیف کا استنباط بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس طرح کے سفروں میں ظہر و عصر، اور مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کر کے بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔

## نماز کی جماعت

نماز اگرچہ تنہا بھی ادا کی جا سکتی ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ اِس کو جماعت کے ساتھ اور ممکن ہو تو کسی معبد میں جا کر ادا کیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی مقصد سے یثرب پہنچ کر سب سے پہلے مسجد تعمیر کی اور مسلمانوں کی ہر بستی اور ہر محلے میں تعمیر مساجد کی روایت اِس کے ساتھ ہی قائم ہو گئی۔ اِن کی حاضری اور نماز با جماعت کا اہتمام بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ عورتیں، بے شک اِس سے مستثنیٰ ہیں، لیکن کسی مسلمان مرد کو بغیر کسی عذر کے اِس سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔

قیام جماعت کا طریقہ درج ذیل ہے:

۱۔ نماز سے پہلے اذان دی جائے گی تا کہ لوگ اِسے سن کر جماعت میں شامل ہو سکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے جو کلمات مقرر فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں:

اَللّٰهُ أَكْبَرُ؛ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ؛ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ؛ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ؛ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ؛ اَللّٰهُ أَكْبَرُ؛ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ.

”اللہ سب سے بڑا ہے؛ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے؛ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؛ نماز کی طرف آؤ؛ فلاح کی طرف آؤ؛ اللہ سب سے بڑا ہے؛ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔“

۲۔ ایک ہی مقتدی ہو تو وہ امام کے دائیں جانب اُس کے ساتھ کھڑا ہو گا اور زیادہ

ہوں تو امام درمیان میں ہوگا اور وہ اُس کے پیچھے صف بنا کر کھڑے ہوں گے۔

۳۔ نماز کھڑی کرنے کے لیے اقامت کہی جائے گی۔ اُس میں اذان ہی کے الفاظ دہرائے جائیں گے۔ اتنا فرق، البتہ ہوگا کہ 'حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ' کے بعد اقامت کہنے والا 'قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ' (نماز کھڑی ہوگئی ہے) بھی کہے گا۔

۴۔ اذان کے کلمات پیش نظر مقصد کے لیے ایک سے زیادہ مرتبہ دہرائے جائیں گے۔

۵۔ اقامت کے کلمات بھی اگر ضرورت ہو تو اِسی طرح دہرائے جا سکتے ہیں۔

## نماز میں غلطی

نماز کے لیے جو اعمال و اذکار مقرر کیے گئے ہیں، اُن میں کوئی غلطی ہو جائے یا شبہ ہو کہ غلطی ہوئی ہے تو یہ سنت قائم کی گئی ہے کہ غلطی کی تلافی کرنا ممکن ہو تو تلافی کے بعد اور ممکن نہ ہو تو اِس کے بغیر ہی نماز کے آخر میں دو سجدے زیادہ کر لیے جائیں۔

## جمعہ کی نماز

جمعہ کے دن مسلمانوں پر لازم کیا گیا ہے کہ نماز ظہر کی جگہ وہ اِسی دن کے لیے خاص ایک اجتماعی نماز کا اہتمام کریں گے۔ اِس نماز کا طریقہ یہ ہے:

یہ نماز دو رکعت پڑھی جائے گی،

نماز ظہر کے برخلاف اِس کی دونوں رکعتوں میں قراءت جہری ہوگی،

نماز کے لیے تکبیر کہی جائے گی،

نماز سے پہلے امام حاضرین کی تذکیر ونصیحت کے لیے دو خطبے دے گا۔ یہ خطبے کھڑے ہو کر دیے جائیں گے۔ پہلے خطبے کے بعد اور دوسرا خطبہ شروع ہونے سے قبل امام چند لمحوں کے لیے بیٹھے گا،

نماز کی اذان اُس وقت دی جائے گی، جب امام خطبے کی جگہ پر آجائے گا،

اذان ہوتے ہی تمام مسلمان مردوں کے لیے ضروری ہے کہ اُن کے پاس اگر کوئی عذر نہ ہو تو اپنی مصروفیات چھوڑ کر نماز کے لیے حاضر ہو جائیں،

نماز کا خطاب اور اُس کی امامت مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کریں گے اور یہ صرف اُنھی مقامات پر ادا کی جائے گی جو اُن کی طرف سے اِس نماز کی جماعت کے لیے مقرر کیے جائیں گے اور جہاں وہ خود یا اُن کا کوئی نمایندہ اِس کی امامت کے لیے موجود ہو گا۔

## عیدین کی نماز

عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن بھی مسلمانوں پر لازم ہے کہ طلوع آفتاب کے بعد اور زوال سے پہلے وہ جمعہ ہی کی طرح ایک اجتماعی نماز کا اہتمام کریں۔ اِس کا طریقہ درج ذیل ہے:

یہ نماز دو رکعت پڑھی جائے گی،

دونوں رکعتوں میں قراءت جہری ہوگی،

قیام کی حالت میں نمازی چند زائد تکبیریں کہیں گے،

نماز کے لیے نہ اذان ہوگی اور نہ تکبیر کہی جائے گی،

نماز کے بعد امام حاضرین کی تذکیر و نصیحت کے لیے دو خطبے دے گا۔ یہ خطبے کھڑے ہو کر دیے جائیں گے۔ پہلے خطبے کے بعد اور دوسرا خطبہ شروع کرنے سے قبل امام چند لمحوں کے لیے بیٹھے گا۔

اِس نماز کا خطاب اور اِس کی امامت بھی نماز جمعہ کی طرح مسلمانوں کے ارباب حل و عقد کریں گے اور یہ اُنھی مقامات پر ادا کی جائے گی جو اُن کی طرف سے اِس نماز کی جماعت کے لیے مقرر کیے جائیں گے اور جہاں وہ خود یا اُن کا کوئی نمایندہ اِس کی امامت کے لیے موجود ہوگا۔

## جنازہ کی نماز

مرنے والوں کے لیے جنازہ کی نماز بھی انبیا علیہم السلام کے دین میں ضروری قرار دی گئی ہے۔

میت کو نہلانے اور اُس کی تجہیز و تکفین کے بعد یہ نماز جس طریقے سے ادا کی جائے گی، وہ یہ ہے:

میت کو اپنے اور قبلہ کے درمیان رکھ کر مقتدی امام کے پیچھے صف بنالیں گے،

رفع یدین کے ساتھ 'اَللّٰہُ اَکْبَرُ' کہہ کر نماز شروع کی جائے گی،

عیدین کی طرح اِس نماز میں بھی چند زائد تکبیریں کہی جائیں گی،

قیام کی حالت ہی میں تکبیرات اور دعاؤں کے بعد سلام پھیر کر نماز ختم کر دی جائے گی۔

نماز کی صورت میں کم سے کم یہی عبادت ہے جس کا مسلمانوں کو مکلّف ٹھیرایا گیا ہے۔ تاہم قرآن کا ارشاد ہے کہ جس نے اپنے شوق سے نیکی کا کوئی کام کیا، اُسے اللہ قبول کرنے والا ہے۔ اِسی طرح فرمایا ہے کہ مصیبت کے موقعوں پر صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ چنانچہ اِن ارشادات کے پیش نظر مسلمان اِس لازمی نماز کے علاوہ بالعموم نوافل کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ اِس طرح کے جو نوافل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھے ہیں یا لوگوں کو پڑھنے کی ترغیب دی ہے، اُن کی تفصیلات روایتوں میں دیکھ لی جا سکتی ہیں۔

## زکوٰۃ

نماز کے بعد یہ دوسری اہم ترین عبادت ہے۔ اپنے معبودوں کے لیے پرستش کے جو آداب انسان نے بالعموم اختیار کیے ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنے مال، مواشی اور پیداوار میں سے ایک حصہ اُن کے حضور میں نذر کے طور پر پیش کیا جائے۔ اِسے صدقہ، نیاز، نذرانے اور بھینٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انبیا علیہم السلام

کے دین میں زکوٰۃ کی حیثیت اصلاً یہی ہے اور اسی بنا پر اِسے عبادت قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے کئی جگہ اِس کے لیے لفظ صدقہ استعمال کیا ہے اور وضاحت فرمائی ہے کہ اِسے دل کی خستگی اور فروتنی کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اِس کے بارے میں عام روایت یہ رہی ہے کہ نذر گزارنے کے بعد اِسے معبد سے اٹھا کر اُس کے خدام کو دیا جاتا تھا کہ وہ اِس سے عبادت کے لیے آنے والوں کی خدمت کریں۔ اب یہ طریقہ باقی نہیں رہا۔ اِس کی جگہ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ نظم اجتماعی کی ضرورتوں کے لیے یہ مال ارباب حل وعقد کے سپرد کر دیا جائے۔ تاہم اِس کی حقیقت میں اِس سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ خدا ہی کے لیے خاص ہے اور اُس کے بندے جب اِسے ادا کرتے ہیں تو اِس کی پذیرائی کا فیصلہ بھی اُسی بارگاہ سے ہوتا ہے۔

## زکوٰۃ کی تاریخ

اِس کی تاریخ وہی ہے جو نماز کی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی طرح اِس کا حکم بھی انبیا علیہم السلام کی شریعت میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں کو اِس کے ادا کرنے کی ہدایت کی تو یہ اُن کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ دین ابراہیمی کے تمام پیرو اِس کے احکام سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ یہ پہلے سے موجود ایک سنت تھی جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے اور ضروری اصلاحات

کے بعد مسلمانوں میں جاری فرمایا ہے۔

## زکوٰۃ کا مقصد

اِس کا مقصد، اگر غور کیجیے تو اِس کے نام ہی سے متعین ہو جاتا ہے۔ اِس لفظ کی اصل نمو اور طہارت ہے۔ لہٰذا اِس سے مراد وہ مال ہے جو پاکیزگی اور طہارت حاصل کرنے کے لیے دیا جائے۔ اِس سے واضح ہے کہ زکوٰۃ کا مقصد وہی ہے جو پورے دین کا ہے۔ یہ نفس کو اُن آلایشوں سے پاک کرتی ہے جو مال کی محبت سے اُس پر آسکتی ہیں، مال میں برکت پیدا کرتی ہے اور نفس انسانی کے لیے اُس کی پاکیزگی کو بڑھانے کا باعث بنتی ہے۔ اللہ کی راہ میں انفاق کا یہ کم سے کم مطالبہ ہے جسے ایک مسلمان کو ہر حال میں پورا کرنا ہے، اِس لیے اِس سے وہ سب کچھ تو حاصل نہیں ہوتا جو اِس سے آگے انفاق کے عام مطالبات کو پورا کرنے سے حاصل ہوتا ہے، تاہم انسان کا دل اِس سے بھی اپنے پروردگار سے لگ جاتا اور اللہ تعالیٰ سے وہ غفلت بڑی حد تک دور ہو جاتی ہے جو دنیا اور اسباب دنیا کے ساتھ تعلق خاطر کی وجہ سے اُس پر طاری ہوتی ہے۔

## زکوٰۃ کا قانون

زکوٰۃ کا قانون درج ذیل ہے:

۱۔ پیداوار، تجارت اور کاروبار کے ذرائع، ذاتی استعمال کی چیزوں اور حد نصاب

سے کم سرمایے کے سوا کوئی چیز بھی زکوۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ ہر مال، ہر قسم کے مواشی اور ہر نوعیت کی پیداوار پر عائد ہوگی اور ہر سال ریاست کے ہر مسلمان شہری سے لازماً وصول کی جائے گی۔

۲۔ اِس کی شرح یہ ہے:

مال میں ۲/۱ ۲ فی صدی سالانہ۔

پیداوار میں اگر وہ اصلاً محنت یا اصلاً سرمایے سے وجود میں آئے تو ہر پیداوار کے موقع پر اُس کا ۱۰ فی صدی، اور اگر محنت اور سرمایہ، دونوں کے تعامل سے وجود میں آئے تو ۵ فی صدی، اور دونوں کے بغیر محض عطیۂ خداوندی کے طور پر حاصل ہو جائے تو ۲۰ فی صدی۔

مواشی میں

ا۔ اونٹ

۵ سے ۲۴ تک، ہر پانچ اونٹوں پر ایک بکری

۲۵ سے ۳۵ تک، ایک یک سالہ اونٹنی اور اگر وہ میسر نہ ہو تو دو سالہ اونٹ

۳۶ سے ۴۵ تک، ایک دو سالہ اونٹنی

۴۶ سے ۶۰ تک، ایک سہ سالہ اونٹنی

۶۱ سے ۷۵ تک، ایک چار سالہ اونٹنی

۷۶ سے ۹۰ تک، دو، دو سالہ اونٹنیاں

۹۱ سے ۱۲۰ تک، دو، سہ سالہ اونٹنیاں

۱۲۰ سے زائد کے لیے ہر ۴۰ پر ایک دو سالہ اور ہر ۵۰ پر ایک سہ سالہ اونٹنی

ب۔ گائیں

ہر ۳۰ پر ایک یک سالہ اور ہر ۴۰ پر ایک دو سالہ بچھڑا

ج۔ بکریاں

۴۰ سے ۱۲۰ تک، ایک بکری

۱۲۱ سے ۲۰۰ تک، دو بکریاں

۲۰۱ سے ۳۰۰ تک، تین بکریاں

۳۰۰ سے زائد میں ہر ۱۰۰ پر ایک بکری

۳۔ زکوٰۃ کے جو مصارف قرآن میں بیان ہوئے ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے:

فقرا و مساکین کے لیے۔

ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں۔

اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام سیاسی اخراجات کے لیے۔

ہر قسم کی غلامی سے نجات کے لیے۔

نقصان، تاوان یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی مدد کے لیے۔

دین کی خدمت اور لوگوں کی بہبود کے کاموں میں۔

مسافروں کی مدد اور اُن کے لیے سڑکوں، پلوں، سراؤں وغیرہ کی تعمیر کے لیے۔

۴۔ زکوٰۃ کی ایک قسم صدقۂ فطر بھی ہے۔ یہ ایک فرد کے لیے صبح وشام کا کھانا ہے جو چھوٹے بڑے ہر شخص کے لیے دینا لازم کیا گیا ہے اور رمضان کے اختتام پر نماز عید سے پہلے دیا جاتا ہے۔

## روزہ

نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسری اہم عبادت روزہ ہے۔ عربی زبان میں اِس کے لیے 'صوم' کا لفظ آتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے رک جانے اور اُس کو ترک کر دینے کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں یہ لفظ خاص حدود وقیود کے ساتھ کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان میں اِسی کو روزہ کہتے ہیں۔ انسان چونکہ اِس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اِس لیے اللہ تعالیٰ کے لیے اُس کا جذبۂ عبادت جب اُس کے عملی وجود سے متعلق ہوتا ہے تو پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ روزہ اِسی اطاعت کا علامتی اظہار ہے۔ اِس میں بندہ اپنے پروردگار کے حکم پر اور اُس کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں بعض مباحات کو اپنے لیے حرام قرار دے کر مجسم اطاعت بن جاتا اور اِس طرح گویا زبان حال سے اِس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے حکم سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اگر قانون فطرت کی رو سے جائز کسی شے کو بھی اُس کے لیے ممنوع ٹھیرا دیتا ہے تو بندے کی حیثیت سے زیبا یہی ہے کہ وہ بے چون وچرا اِس

حکم کے سامنے سرِتسلیم خم کردے۔

اللہ کی عظمت و جلالت اور اُس کی بزرگی اور کبریائی کے احساس واعتراف کی یہ حالت، اگر غور کیجیے تو اُس کی شکرگزاری کا حقیقی اظہار بھی ہے۔ چنانچہ قرآن نے اِسی بنا پر روزے کو خدا کی تکبیر اور شکرگزاری قرار دیا اور فرمایا ہے کہ اِس مقصد کے لیے رمضان کا مہینا اِس لیے خاص کیا گیا ہے کہ قرآن کی صورت میں اللہ نے جو ہدایت اِس مہینے میں تمھیں عطا فرمائی ہے اور جس میں عقل کی رہنمائی اور حق و باطل میں فرق و امتیاز کے لیے واضح اور قطعی حجتیں ہیں، اُس پر اللہ کی بڑائی کرو اور اُس کے شکرگزار بنو۔

اِس کا منتہاے کمال یہ ہے کہ آدمی روزے کی حالت میں اپنے اوپر مزید کچھ پابندیاں عائد کرکے اور دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر چند دنوں کے لیے مسجد میں بیٹھ جائے اور زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کرے۔ اصطلاح میں اِسے اعتکاف کہا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ رمضان کے روزوں کی طرح لازم تو نہیں کیا گیا، لیکن تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔ روزہ و نماز اور تلاوت قرآن کے امتزاج سے جو خاص کیفیت اِس سے پیدا ہوتی اور نفس پر تجرد و انقطاع اور تبتل الی اللہ کی جو حالت طاری ہو جاتی ہے، اُس سے روزے کا اصلی مقصود درجۂ کمال پر حاصل ہوتا ہے۔

## روزے کی تاریخ

نماز کی طرح روزے کی تاریخ بھی نہایت قدیم ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ روزہ

مسلمانوں پر اُسی طرح فرض کیا گیا، جس طرح وہ پہلی قوموں پر فرض کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ تربیت نفس کی ایک اہم عبادت کے طور پر اِس کا تصور تمام مذاہب میں رہا ہے۔

## روزے کا مقصد

اِس کا مقصد قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ لوگ خدا کا تقویٰ اختیار کر لیں۔ قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے شب و روز کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رکھ کر زندگی بسر کرے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اِس بات سے ڈرتا رہے کہ اُس نے اگر کبھی اِن حدود کو توڑا تو اِس کی پاداش سے اللہ کے سوا کوئی اُس کو بچانے والا نہیں ہو سکتا۔

## روزے کا قانون

اِس کا قانون درج ذیل ہے:

روزے کی نیت سے اور محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھانے پینے اور بیویوں کے ساتھ تعلق سے اجتناب ہی روزہ ہے۔

یہ پابندی فجر سے لے کر رات کے شروع ہونے تک ہے، لہٰذا روزے کی راتوں میں کھانا پینا اور بیویوں کے پاس جانا بالکل جائز ہے۔

روزوں کے لیے رمضان کا مہینا خاص کیا گیا ہے، اِس لیے جو شخص اِس مہینے میں

موجود ہو، اُس پر فرض ہے کہ اِس پورے مہینے کے روزے رکھے۔

بیماری یا سفر کی وجہ سے یا کسی اور مجبوری کے باعث آدمی اگر رمضان کے روزے پورے نہ کر سکے تو لازم ہے کہ دوسرے دنوں میں رکھ کر اُس کی تلافی کرے اور یہ تعداد پوری کر دے۔

حیض و نفاس کی حالت میں روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ تاہم اِس طرح چھوڑے ہوئے روزے بھی بعد میں لازماً پورے کیے جائیں گے۔

روزے کا منتہاے کمال اعتکاف ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی شخص کو اِس کی توفیق دے تو اُسے چاہیے کہ روزوں کے مہینے میں جتنے دنوں کے لیے ممکن ہو، دنیا سے الگ ہو کر اللہ کی عبادت کے لیے مسجد میں گوشہ نشین ہو جائے اور بغیر کسی ناگزیر انسانی ضرورت کے مسجد سے باہر نہ نکلے۔

آدمی اعتکاف کے لیے بیٹھا ہو تو روزے کی راتوں میں کھانے پینے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن بیویوں کے پاس جانا اُس کے لیے جائز نہیں رہتا۔ اعتکاف کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اِسے ممنوع قرار دیا ہے۔

## حج و عمرہ

یہ دونوں عبادات دین ابراہیمی میں عبادت کا منتہاے کمال ہیں۔ اِن کی تاریخ اُس منادی سے شروع ہوتی ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے مسجد حرام کی تعمیر کے بعد

کی تھی کہ لوگ خداوند کی نذر چڑھانے کے لیے آئیں اور توحید پر ایمان کا جو عہد اُنھوں نے باندھ رکھا ہے، اُسے یہاں آ کر تازہ کریں۔

اپنے معبود کے لیے جذبۂ پرستش کا یہ آخری درجہ ہے کہ اُس کے طلب کرنے پر بندہ اپنا جان و مال، سب اُس کے حضور میں نذر کر دینے کے لیے حاضر ہو جائے۔ حج و عمرہ اِسی نذر کی تمثیل ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کو ممثل کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمرہ اجمال ہے اور حج اِس لحاظ سے اُس کی تفصیل کر دیتا ہے کہ اِس سے وہ مقصد بھی بالکل نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا ہے جس کے لیے جان و مال نذر کر دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آدم کی تخلیق سے اُس کی جو اسکیم دنیا میں برپا ہوئی ہے، ابلیس نے پہلے دن ہی سے اُس کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اللہ کے بندے اب قیامت تک کے لیے اپنے اِس ازلی دشمن اور اِس کی ذریت کے خلاف برسر جنگ ہیں۔ یہی اِس دنیا کی آزمایش ہے جس میں کامیابی اور ناکامی پر انسان کے ابدی مستقبل کا انحصار ہے۔ اپنا جان و مال ہم اِسی جنگ کے لیے اللہ کی نذر کرتے ہیں۔ ابلیس کے خلاف اِس جنگ کو حج میں ممثل کیا گیا ہے۔ یہ تمثیل اِس طرح ہے:

اللہ کے بندے اپنے پروردگار کی ندا پر دنیا کے مال و متاع اور اُس کی لذتوں اور مصروفیتوں سے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

پھر 'لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ' کہتے ہوئے میدان جنگ میں پہنچتے اور بالکل مجاہدین کے طریقے

پر ایک وادی میں ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔

اگلے دن ایک کھلے میدان میں پہنچ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے، اِس جنگ میں کامیابی کے لیے دعا و مناجات کرتے اور اپنے امام کا خطبہ سنتے ہیں۔

تمثیل کے تقاضے سے نمازیں قصر اور جمع کر کے پڑھتے اور راستے میں مختصر پڑاؤ کرتے ہوئے دوبارہ اپنے ڈیروں پر پہنچ جاتے ہیں۔

پھر شیطان پر سنگ باری کرتے، اپنے جانوروں کی قربانی پیش کر کے اپنے آپ کو خداوند کی نذر کرتے، سر منڈاتے اور نذر کے پھیروں کے لیے اصل معبد اور قربان گاہ میں حاضر ہو جاتے ہیں۔

پھر وہاں سے لوٹتے اور اگلے دو یا تین دن اِسی طرح شیطان پر سنگ باری کرتے رہتے ہیں۔

اِس لحاظ سے دیکھیے تو حج و عمرہ میں احرام اِس بات کی علامت ہے کہ بندۂ مومن نے دنیا کی لذتوں، مصروفیتوں اور مرغوبات سے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور دو اَن سلی چادروں سے اپنا بدن ڈھانپ کر وہ برہنہ سر اور کسی حد تک برہنہ پا بالکل راہبوں کی صورت بنائے ہوئے اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہے۔

تلبیہ اُس صدا کا جواب ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیت الحرام کی تعمیر نو کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر بلند کی تھی۔ اب یہ صدا دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی ہے اور اللہ کے بندے اُس کی نعمتوں کا اعتراف اور اُس کی

توحید کا اقرار کرتے ہوئے اِس صدا کے جواب میں 'لَبَّیْکَ، اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ' کا یہ دل نواز ترانہ پڑھتے ہیں۔

طواف نذر کے پھیرے ہیں۔ دین ابراہیمی میں یہ روایت قدیم سے چلی آرہی ہے کہ جس کی قربانی کی جائے یا جس کو معبد کی خدمت کے لیے نذر کیا جائے، اُسے معبد یا قربان گاہ کے سامنے پھرایا جائے۔

حجر اسود کا استلام تجدید عہد کی علامت ہے۔ اِس میں بندہ اِس پتھر کو تمثیلاً اپنے پروردگار کا ہاتھ قرار دے کر اِس ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتا اور عہد و میثاق کی قدیم روایت کے مطابق اِس کو چوم کر اپنے اِس عہد کی تجدید کرتا ہے کہ اسلام قبول کر کے وہ جنت کے عوض اپنا جان و مال، سب اللہ کے سپرد کر چکا ہے۔

سعی اسمٰعیل علیہ السلام کی قربان گاہ کا طواف ہے۔ سیدنا ابراہیم نے صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اِس قربان گاہ کو دیکھا تھا اور پھر حکم کی تعمیل کے لیے ذرا تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے مروہ کی طرف گئے تھے۔ چنانچہ صفا و مروہ کا یہ طواف بھی نذر کے پھیرے ہیں جو پہلے معبد کے سامنے اور اِس کے بعد قربانی کی جگہ پر لگائے جاتے ہیں۔

عرفات معبد کا قائم مقام ہے، جہاں شیطان کے خلاف اِس جنگ کے مجاہدین جمع ہوتے، اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور اِس جنگ میں کامیابی کے لیے دعا و مناجات کرتے ہیں۔

مزدلفہ راستے کا پڑاؤ ہے، جہاں وہ رات گزارتے اور صبح اُٹھ کر میدان میں

اترنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر دعا و مناجات کرتے ہیں۔

رمی ابلیس پر لعنت اور اُس کے خلاف جنگ کی علامت ہے۔ یہ عمل اس عزم کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ بندۂ مومن ابلیس کی پسپائی سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوگا۔ یہ معلوم ہے کہ انسان کا یہ ازلی دشمن جب وسوسہ انگیزی کرتا ہے تو اِس کے بعد خاموش نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ تاہم مزاحمت کی جائے تو اِس کی تاخت بتدریج کمزور ہو جاتی ہے۔ تین دن کی رمی اور اِس کے لیے پہلے بڑے اور اِس کے بعد چھوٹے جمرات کی رمی سے اِسی بات کو ظاہر کیا گیا ہے۔

قربانی جان کا فدیہ ہے اور سر کے بال مونڈنا اِس بات کی علامت ہے کہ نذر پیش کر دی گئی اور اب بندہ اپنے خداوند کی اطاعت اور دائمی غلامی کی اِس علامت کے ساتھ اپنے گھر لوٹ سکتا ہے۔

اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس قدر غیر معمولی عبادت ہے جو ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں کم سے کم ایک مرتبہ فرض کی گئی ہے۔

## حج و عمرہ کا مقصد

حج و عمرہ کا مقصد وہی ہے جو اِن کی حقیقت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف، اُس کی توحید کا اقرار اور اِس بات کی یاد دہانی کہ اسلام قبول کر کے ہم اپنے آپ کو پروردگار کی نذر کر چکے ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی معرفت اور دل و دماغ میں جن

کے رسوخ کو قرآن نے مقامات حج کے منافع سے تعبیر کیا ہے۔ یہ مقصد ذکر کے اُن الفاظ سے نہایت خوبی کے ساتھ واضح ہوتا ہے جو اِس عبادت کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اِسی مقصد کو نمایاں رکھنے اور ذہنوں میں پوری طرح راسخ کر دینے کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔ چنانچہ احرام باندھ لینے کے بعد یہ الفاظ ہر شخص کی زبان پر مسلسل جاری رہتے ہیں:

لَبَّیْکَ، اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ؛ لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ، لَبَّیْکَ؛ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ؛ لَاشَرِیْکَ لَکَ.

''میں حاضر ہوں، اے اللہ، میں حاضر ہوں؛ حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں؛ میں حاضر ہوں، حمد تیرے لیے ہے، سب نعمتیں تیری ہیں اور بادشاہی بھی تیرے ہی لیے ہے؛ تیرا کوئی شریک نہیں۔''

## حج و عمرہ کے ایام

عمرہ کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ یہ پورے سال میں لوگ جب چاہیں، کر سکتے ہیں۔ حج کے لیے، البتہ ۸/ ذوالحجہ سے ۱۳/ ذوالحجہ تک کے ایام مقرر ہیں اور یہ اِنھی ایام میں ہو سکتا ہے۔

## حج و عمرہ کا طریقہ

حج و عمرہ کے لیے جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے:

## عمرہ

اِس عبادت کی نیت سے اِس کا احرام باندھا جائے۔

باہر سے آنے والے یہ احرام اپنی میقات سے باندھیں؛ مقیم خواہ وہ مکی ہوں یا عارضی طور پر مکہ میں ٹھیرے ہوئے ہوں، اِسے حدودِ حرم سے باہر کسی جگہ سے باندھیں؛ اور جو لوگ اِن حدود سے باہر، لیکن میقات کے اندر رہتے ہوں، اُن کی میقات وہی جگہ ہے، جہاں وہ مقیم ہیں، وہ وہیں سے احرام باندھ لیں اور تلبیہ پڑھنا شروع کر دیں۔

بیت اللہ میں پہنچنے تک تلبیہ کا ورد جاری رکھا جائے۔

وہاں پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کیا جائے۔

پھر صفا و مروہ کی سعی کی جائے۔

ہدی کے جانور ساتھ ہوں تو اُن کی قربانی کی جائے۔

قربانی کے بعد مرد سر منڈوا کر یا حجامت کرا کے اور عورتیں اپنی چوٹی کے آخر سے تھوڑے سے بال کاٹ کر احرام کھول دیں۔

یہ احرام ایک اصطلاح ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ شہوت کی کوئی بات نہیں کریں گے؛ زیب و زینت کی کوئی چیز، مثلاً خوشبو وغیرہ استعمال نہیں کریں گے؛ ناخن نہیں تراشیں گے، نہ جسم کے کسی حصے کے بال اتاریں گے، نہ میل کچیل دور کریں گے، یہاں تک کہ اپنے بدن کی جوئیں بھی نہیں ماریں گے؛ شکار نہیں کریں گے؛ سلے

ہوئے کپڑے نہیں پہنیں گے؛ اپنا سر، چہرہ اور پاؤں کے اوپر کا حصہ کھلا رکھیں گے، اور ایک چادر تہ بند کے طور پر باندھیں گے اور ایک اوڑھ لیں گے۔

عورتیں، البتہ سلے ہوئے کپڑے پہنیں گی اور سر اور پاؤں بھی ڈھانپ سکیں گی۔ اُن کے لیے صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھنے ضروری ہیں۔

میقات اُن جگہوں کو کہتے ہیں جو حج و عمرہ کی غرض سے آنے والوں کے لیے حدود حرم سے کچھ فاصلے پر متعین کر دی گئی ہیں۔ اِن سے آگے وہ احرام کے بغیر نہیں جا سکتے۔ یہ جگہیں پانچ ہیں: مدینہ سے آنے والوں کے لیے ذوالحلیفہ، یمن سے آنے والوں کے لیے یلملم، مصر و شام سے آنے والوں کے لیے جحفہ، نجد سے آنے والوں کے لیے قرن اور مشرق کی طرف سے آنے والوں کے لیے ذات عرق۔

تلبیہ سے مراد، 'لَبَّيْكَ، اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ؛ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ، لَبَّيْكَ؛ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ؛ لَا شَرِيْكَ لَكَ' کا ورد ہے جو احرام باندھتے ہی شروع ہوتا اور بیت اللہ میں پہنچنے تک برابر جاری رہتا ہے۔ حج و عمرہ کے لیے تنہا یہی ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔

طواف کا لفظ اُن سات پھیروں کے لیے بولا جاتا ہے جو ہر طرح کی نجاست سے پاک ہو کر بیت اللہ کے گرد لگائے جاتے ہیں۔ اِن میں سے ہر پھیرا حجر اسود* سے

* یہ بیت اللہ کی پرانی تعمیر کا پتھر ہے جسے تجدید عہد کی علامت کے طور پر اُس کے ایک گوشے میں نصب کیا گیا ہے۔

شروع ہو کر اُسی پر ختم ہوتا ہے اور ہر پھیرے کی ابتدا میں حجر اسود کا استلام کیا جاتا ہے۔ یہ حجر اسود کو چومنے یا ہاتھ سے اُس کو چھو کر اپنا ہاتھ چوم لینے کے لیے ایک اصطلاح ہے۔ ہجوم کی صورت میں ہاتھ سے یا ہاتھ کی چھڑی سے یا اِس طرح کی کسی دوسری چیز سے اشارہ کر دینا بھی اِس کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔

سعی سے مراد صفا و مروہ کا طواف ہے۔ یہ بھی سات پھیرے ہیں جو صفا سے شروع ہوتے ہیں۔ صفا سے مروہ تک ایک اور مروہ سے صفا تک دوسرا پھیرا شمار کیا جاتا ہے۔ اِن میں سے آخری پھیرا مروہ پر ختم ہوتا ہے۔

قربانی کی طرح صفا و مروہ کی یہ سعی بھی بطور تطوع کی جاتی ہے۔ یہ عمرے کا کوئی لازمی حصہ نہیں ہے۔ عمرہ اِس کے بغیر بھی مکمل ہو جاتا ہے۔

ہدی کا لفظ اُن جانوروں کے لیے بولا جاتا ہے جو حرم میں قربانی کے لیے خاص کیے گئے ہوں۔ دوسرے جانوروں سے اُن کو ممیز رکھنے کے لیے اُن کے جسم پر نشان لگائے جاتے اور گلے میں پٹے ڈالے جاتے ہیں۔

## حج

عمرے کی طرح حج کے لیے بھی پہلا کام یہی ہے کہ اِس کی نیت سے اِس کا احرام باندھا جائے۔

باہر سے آنے والے یہ احرام اپنی میقات سے باندھیں؛ مقیم خواہ وہ مکی ہوں یا

عارضی طور پر مکہ میں ٹھیرے ہوئے ہوں یا حدود حرم سے باہر، لیکن میقات کے اندر رہتے ہوں، اُن کی میقات وہی جگہ ہے، جہاں وہ مقیم ہیں، وہ وہیں سے احرام باندھ لیں اور تلبیہ پڑھنا شروع کر دیں۔

۸/ذوالحجہ کو منیٰ کے لیے روانہ ہوں اور وہاں قیام کریں۔

۹/ذوالحجہ کی صبح عرفات کے لیے روانہ ہوں۔

وہاں پہنچ کر امام ظہر کی نماز سے پہلے حج کا خطبہ دے، پھر ظہر اور عصر کی نماز جمع اور قصر کر کے پڑھی جائے۔

نماز سے فارغ ہو کر جتنی دیر کے لیے ممکن ہو، اللہ تعالیٰ کے حضور میں تسبیح و تحمید، تکبیر و تہلیل اور دعا و مناجات کی جائے۔

غروب آفتاب کے بعد مزدلفہ کے لیے روانہ ہوں۔

وہاں پہنچ کر مغرب اور عشا کی نماز جمع اور قصر کر کے پڑھی جائے۔

رات کو اِسی میدان میں قیام کیا جائے۔

فجر کے بعد یہاں بھی تھوڑی دیر کے لیے عرفات ہی کی طرح تسبیح و تحمید، تکبیر و تہلیل اور دعا و مناجات کی جائے۔

پھر منیٰ کے لیے روانہ ہوں اور وہاں جمرۂ عقبہ کے پاس پہنچ کر تلبیہ پڑھنا بند کر دیا جائے اور اِس جمرے کو سات کنکریاں ماری جائیں۔

ہدی کے جانور ساتھ ہوں یا نذر اور کفارے کی کوئی قربانی واجب ہو چکی ہو تو یہ

قربانی کی جائے۔

پھر مرد سر منڈوا کر یا حجامت کرا کے اور عورتیں اپنی چوٹی کے آخر سے تھوڑے سے بال کاٹ کر احرام کا لباس اتار دیں۔

پھر بیت اللہ پہنچ کر اُس کا طواف کیا جائے۔

احرام کی تمام پابندیاں اِس کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گی، اِس کے بعد اگر شوق ہو تو بطور تطوع صفا و مروہ کی سعی بھی کی جائے۔

پھر منیٰ واپس پہنچ کر دو یا تین دن قیام کیا جائے اور روزانہ پہلے جمرۃ الاولیٰ، پھر جمرۃ الوسطیٰ اور اِس کے بعد جمرۃ الاخریٰ کو سات سات کنکریاں ماری جائیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے حج و عمرہ کے مناسک یہی ہیں۔ قرآن نے اِن میں کوئی تبدیلی نہیں کی، صرف اتنا کیا ہے کہ اِن سے متعلق بعض فقہی احکام کی توضیح فرما دی ہے۔

یہ احکام درج ذیل ہیں:

پہلا حکم یہ ہے کہ حج و عمرہ کے تعلق سے جو حرمتیں اللہ تعالیٰ نے قائم کر دی ہیں، اُن کی تعظیم ایمان کا تقاضا ہے، وہ ہر حال میں قائم رہنی چاہییں۔ تاہم کوئی دوسرا فریق اگر اُنھیں ملحوظ رکھنے سے انکار کر دیتا ہے تو اِس کے بدلے میں مسلمانوں کو بھی حق ہے کہ وہ برابر کا اقدام کریں، اِس لیے کہ اِس طرح کی حرمتیں باہمی طور پر ہی قائم رہ سکتی ہیں، اُنھیں کوئی فریق اپنے طور پر قائم نہیں رکھ سکتا۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ اِس اجازت کے باوجود مسلمان اپنی طرف سے کوئی پیش قدمی نہیں کر سکتے۔ یہ اللہ کی حرمتیں ہیں، اِن کے توڑنے میں پہل ایک بدترین جرم ہے۔ اِس کا ارتکاب کسی حال میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔

تیسرا حکم یہ ہے کہ حالت احرام میں شکار کی ممانعت صرف خشکی کے جانوروں کے لیے ہے، دریائی جانوروں کا شکار کرنا یا دوسروں کا کیا ہوا شکار کھا لینا، دونوں جائز ہیں۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لوگ اِس رخصت سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ خشکی کا شکار ہر حال میں ممنوع ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے اِس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اُسے کفارہ ادا کرنا چاہیے۔

اِس کی تین صورتیں ہیں:

جس طرح کا جانور شکار کیا گیا ہے، اُسی قبیل کا کوئی جانور گھریلو چوپایوں میں سے قربانی کے لیے بیت اللہ بھیجا جائے۔

اگر یہ ممکن نہ ہو تو اُس جانور کی قیمت کی نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔

یہ بھی دشوار ہو تو اتنے روزے رکھے جائیں، جتنے مسکینوں کو کھانا کھلانا کسی شخص پر عائد ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ جانوروں کا بدل کیا ہے یا اگر جانور کی قربانی متعذر ہے تو اُس کی قیمت کیا ہوگی یا اُس کے بدلے میں کتنے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے یا کتنے روزے رکھے جائیں گے تو اِس کا فیصلہ مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمی کریں گے

تا کہ جرم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے اپنے نفس کی جانب داری کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

چوتھا حکم یہ ہے کہ حج و عمرہ کے لیے سفر کرنے والے اگر کسی جگہ گھر جائیں اور اُن کے لیے آگے جانا ممکن نہ رہے تو اونٹ، گائے، بکری میں سے جو میسر ہو، اُسے قربانی کے لیے بھیج دیں یا بھیجنا ممکن نہ ہو تو اُسی جگہ قربانی کر دیں اور سر منڈوا کر احرام کھول دیں۔ اُن کا حج و عمرہ یہی ہے۔ اِس معاملے میں یہ بات، البتہ واضح رہنی چاہیے کہ قربانی اِس طرح کی کسی جگہ پر کی جائے یا مکہ اور منیٰ میں، اُس سے پہلے سر منڈوانا جائز نہیں ہے، الاّ یہ کہ کوئی شخص بیمار ہو یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور وہ قربانی سے پہلے ہی سر منڈوانے پر مجبور ہو جائے۔ قرآن نے اجازت دی ہے کہ اس طرح کی کوئی مجبوری پیش آجائے تو لوگ سر منڈوا لیں، لیکن روزوں یا صدقے یا قربانی کی صورت میں اُس کا فدیہ دیں اور اُن کی تعداد اور مقدار اپنی صواب دید سے جو مناسب سمجھیں طے کر لیں۔

پانچواں حکم یہ ہے کہ باہر سے آنے والے اگر ایک ہی سفر میں حج و عمرہ، دونوں کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے عمرہ کر کے احرام کھول دیں، پھر ۸/ ذوالحجہ کو مکہ ہی میں دوبارہ احرام باندھ کر حج کر لیں۔ یہ محض ایک رخصت ہے جو اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ سفر کی زحمت کے پیش نظر باہر سے آنے والے عازمین حج کو عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا وہ اِس کا فدیہ دیں گے۔ اِس کی دو صورتیں ہیں:

اونٹ، گائے اور بکری میں سے جو جانور بھی میسر ہو، اُس کی قربانی کی جائے۔ یہ ممکن نہ ہو تو دس روزے رکھے جائیں: تین حج کے دنوں میں اور سات حج سے واپسی کے بعد۔

اِس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ حج کے لیے الگ اور عمرے کے لیے الگ سفر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن نے صراحت کر دی ہے کہ یہ رعایت اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جن کے گھر در مسجد حرام کے پاس ہوں۔

چھٹا حکم یہ ہے کہ منیٰ سے ۱۲/ ذوالحجہ کو بھی واپس آ سکتے ہیں اور چاہیں تو ۱۳/ ذوالحجہ تک بھی ٹھیر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ دونوں ہی صورتوں میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اِس لیے کہ اصل اہمیت اِس کی نہیں کہ لوگ کتنے دن ٹھیرے، بلکہ اِس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے، خدا کی یاد میں اور اُس سے ڈرتے ہوئے ٹھیرے۔

## قربانی

دنیا کے تمام مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ اِس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اُس جانور کے بدلے میں چھڑا لی جاتی ہے جسے ہم اِس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔

## قربانی کی تاریخ

اِس کی تاریخ آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اُن کے دو بیٹوں، (ہابیل اور قابیل) نے اپنی اپنی نذر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کی تو ایک کی نذر قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی۔ بائیبل میں صراحت ہے کہ ہابیل نے اِس موقع پر اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلونٹے بچوں کی قربانی پیش کی تھی۔

یہ طریقہ بعد میں بھی، ظاہر ہے کہ قائم رہا ہو گا۔ چنانچہ اِس کے آثار ہم کو تمام مذاہب میں ملتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے بعد، البتہ جو اہمیت و عظمت اور وسعت و ہمہ گیری اِس عبادت کو حاصل ہوئی ہے، وہ اِس سے پہلے، یقیناً حاصل نہیں تھی۔ اُنھیں جب یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے کی جگہ جانور کی قربانی دیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اسمٰعیل کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا ہے۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ ابراہیم کی یہ نذر قبول کر لی گئی ہے اور اب پشت بہ پشت لوگ اپنی قربانیوں کے ذریعے سے اِس واقعے کی یاد قائم رکھیں گے۔ حج و عمرہ کے موقع پر اور عید الاضحیٰ کے دن یہی قربانی ہے جو ہم ایک نفل عبادت کے طور پر پورے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔

## قربانی کا مقصد

اِس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں

کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام و اخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اِس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اِسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔

یہ، اگر غور کیجیے تو پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے اور 'بِسْمِ اللّٰہِ، وَاللّٰہُ أَکْبَرُ' کہہ کر ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔

## قربانی کا قانون

اِس کا قانون یہ ہے:

قربانی انعام کی قسم کے تمام چوپایوں کی ہو سکتی ہے۔

اِس کا جانور بے عیب اور اچھی عمر کا ہونا چاہیے۔

قربانی کا وقت یوم النحر ۱۰ رذوالحجہ کو عید الاضحیٰ کی نماز سے فراغت کے بعد شروع ہوتا ہے۔

اِس کے ایام وہی ہیں جو مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اصطلاح میں اِنھیں ایام تشریق کہا جاتا ہے۔ قربانی کے علاوہ اِن ایام میں یہ سنت بھی قائم کی گئی ہے کہ ہر نماز کی جماعت کے بعد تکبیریں کہی جائیں۔

نمازوں کے بعد تکبیر کا یہ حکم مطلق ہے۔ اِس کے کوئی خاص الفاظ شریعت میں مقرر نہیں کیے گئے۔

قربانی کا گوشت لوگ خود بھی بغیر کسی تردد کے کھا سکتے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔

۲

# قانون معاشرت

انسان کے خالق نے اُسے ایک معاشرت پسند حیوان کی فطرت عطا فرمائی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اِس طرح نہیں ہوتی کہ اُس کا خالق اُسے آسمان پر کہیں بنا کر بالکل عالم شباب میں براہ راست زمین پر نازل کرتا اور پھر ہرم وشیب کے مراحل سے گزارے بغیر اِسی عالم شباب میں اُسے واپس لے جاتا ہے۔ اِس کے برخلاف اُس کا معاملہ یہ ہے کہ وہ تہ بہ تہ ظلمتوں میں ایک ناتواں بچے کی حیثیت سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ آغوش مادر میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ہمکتا، کھیلتا، دوسروں کے ہاتھ سے کھاتا، پیتا اور اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ وہ پہلے زمین پر گھسٹتا، گھٹنوں کے بل چلتا اور پھر بڑی مشکل سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوتا ہے۔ اِس کے بعد بھی قدم قدم پر اُسے سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ یہاں تک کہ بچپن اور لڑکپن کے کئی مراحل طے کر کے وہ پندرہ یا سولہ برس کے سن کو پہنچ کر کہیں جوان ہوتا ہے۔ اُس کا یہ دور شباب بھی بیس تیس برس سے زیادہ طویل نہیں ہوتا۔

اِس کے بعد وہ دیکھتا ہے کہ بڑھاپے کے آثار نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور بارہا علم و معرفت کی انتہائی بلندیوں کو چھونے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر ناتواں بچوں ہی کی طرح دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔

انسان کا یہ معاملہ لازماً تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایک معاشرت پسند ہستی کی زندگی بسر کرے۔ مرد و عورت کی حیثیت سے یہ معاشرت خلقت کی ابتدا ہی سے بہ تمام و کمال خود اُس کے اندر چھپی ہوتی ہے۔ اِس کو تلاش کرنے کے لیے اُسے اپنے وجود سے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اِس دنیا میں آتا ہے تو اپنا ساز و برگ اور خیمہ و خرگاہ ساتھ لے کر آتا ہے اور وادی و کوہسار ہو یا دشت و بیاباں، ہر جگہ اپنی بزم خود آراستہ کر لیتا ہے۔

انسان کی تاریخ بتاتی ہے کہ اُس کی تخلیق میں پنہاں اِسی اسکیم کے پیش نظر سیدنا آدم علیہ السلام جب پہلے انسان کی حیثیت سے اِس دنیا میں تشریف لائے تو اُنھیں تنہا نہیں بھیجا گیا، بلکہ اُن کی رفاقت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اُنھی کی جنس سے اُن کا جوڑا بنایا۔ پھر اُس سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے، یہاں تک کہ خاندان، قبیلہ اور بالآخر ریاست کی سطح پر نظم معاشرت وجود میں آیا جس میں انسان کو وہ سب کچھ میسر ہو گیا جو اُس کی مخفی صلاحیتوں کو روبہ عمل کرنے کے لیے ناگزیر تھا۔

یہی حقائق ہیں جن کے پیش نظر انبیا علیہم السلام کے دین میں زوجین کی مستقل رفاقت کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ انسان کو اُس کے بچپن سے بڑھاپے تک سامنے

رکھ کر دیکھا جائے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ اُس کی حیاتی، نفسیاتی، اور معاشرتی ضرورتوں کے لحاظ سے یہی طریقہ عقل وفطرت کے مطابق ہے۔ اِس سے جو معاشرت وجود میں آتی ہے، اُس کے بعض اہم معاملات میں عقل انسانی کی رہنمائی کے لیے ایک مفصل قانون انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے بنی آدم کو دیا گیا ہے۔ اسے ہم درج ذیل عنوانات کے تحت بیان کرسکتے ہیں:

## نکاح

عورتوں اور مردوں کے ایک دوسرے سے جنسی تسکین حاصل کرنے کا جائز طریقہ صرف نکاح ہے۔ علانیہ ایجاب وقبول کے ساتھ یہ مرد وعورت کے درمیان مستقل رفاقت کا عہد ہے جو لوگوں کے سامنے اور کسی ذمہ دار شخصیت کی طرف سے اِس موقع پر تذکیر ونصیحت کے بعد پورے اہتمام اور سنجیدگی کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔ اِس کے لیے عورتیں بھی مردوں کی طرح اپنی مرضی کی مالک ہیں اور حدود الٰہی کے اندر اپنے فیصلے کرنے کے لیے پوری طرح آزاد ہیں۔ اُن کی رضامندی کے بغیر کوئی چیز اُن پر مسلط نہیں کی جاسکتی۔

## محرمات

ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھانجی اور بھتیجی سے نکاح ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ماں کے لیے بیٹے، بیٹی کے لیے باپ، بہن کے لیے بھائی، پھوپھی کے لیے بھتیجے، خالہ کے لیے بھانجے، بھانجی کے لیے ماموں اور بھتیجی کے لیے چچا کی نگاہ

جنس و شہوت کی ہر آلایش سے پاک رہے۔ اِس لیے کہ اِن رشتوں میں اِس نوعیت کا علاقہ شرفِ انسانی کا ہادم اور شرم و حیا کے اُس پاکیزہ احساس کے بالکل منافی ہے جو انسانوں اور جانوروں میں وجہ امتیاز ہے۔ یہی حکم رضاعی رشتوں کا ہے۔ چنانچہ ہر وہ رشتہ جو نسب کے تعلق سے حرام ہے، رضاعت سے بھی حرام ہو جاتا ہے۔ نسب اور رضاعت کے بعد ایک تعلق مصاہرت کا ہے۔ اِس سے جو رشتے پیدا ہوتے ہیں، اُن کا تقدس بھی فطرتِ انسانی کے لیے بالکل واضح ہے۔ چنانچہ خسر کے لیے بہو اور شوہر کے لیے بیوی کی ماں، بیٹی، بہن، خالہ، پھوپھی، بھانجی اور بھتیجی سے نکاح ممنوع ہے۔ تاہم یہ رشتے چونکہ بیوی اور شوہر کی وساطت سے قائم ہوتے ہیں اور اِس سے ایک نوعیت کا ضعف اِن میں پیدا ہو جاتا ہے، اِس لیے قرآن نے یہ تین شرطیں اِن پر عائد کر دی ہیں:

ایک یہ کہ بیٹی صرف اُس بیوی کی حرام ہے جس سے خلوت ہو جائے۔

دوسری یہ کہ بہو کی حرمت کے لیے بیٹے کا صلبی ہونا ضروری ہے۔

تیسری یہ کہ بیوی کی بہن، پھوپھی، خالہ، بھانجی اور بھتیجی کی حرمت اُس حالت کے ساتھ خاص ہے، جب میاں بیوی میں نکاح کا رشتہ قائم ہو۔

اِن رشتوں کے علاوہ سوتیلی ماں کے ساتھ اور اُس عورت کے ساتھ بھی نکاح ممنوع قرار دیا گیا ہے جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہو۔

## حدود و شرائط

نکاح مال، یعنی مہر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے

عائد کردہ ایک فریضہ کی حیثیت سے یہ نکاح کی ایک لازمی شرط ہے۔ مرد و عورت نکاح کے ذریعے سے مستقل رفاقت کا جو عہد باندھتے ہیں، اُس میں نان و نفقہ کی ذمہ داریاں ہمیشہ سے مرد اٹھاتا رہا ہے، یہ اُس کی علامت (token) ہے۔ اِس کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی گئی۔ اِسے معاشرے کے دستور اور لوگوں کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ عورت کی سماجی حیثیت اور مرد کے معاشی حالات کی رعایت سے وہ جتنا مہر چاہیں، مقرر کر سکتے ہیں۔

نکاح کے لیے پاک دامن ہونا بھی ضروری ہے۔ کوئی زانی کسی عفیفہ سے اور کوئی زانیہ کسی مرد عفیف سے نکاح نہیں کر سکتی، اِلّا یہ کہ معاملہ عدالت میں نہ پہنچا ہو اور وہ توبہ و استغفار کے ذریعے سے اپنے آپ کو اِس گناہ سے پاک کر لیں۔ یہی معاملہ شرک کا ہے۔ جس طرح یہ بات گوارا نہیں کی جا سکتی کہ میاں اور بیوی میں سے کوئی دوسرے کے بستر پر سوئے، اِسی طرح یہ بات بھی کسی مسلمان کے لیے قابل برداشت نہیں ہو سکتی کہ اُس کے گھر میں خدا کے ساتھ کسی اور کی پرستش کی جائے، بلکہ یہ اُس کے نزدیک کسی اور کے بستر پر سونے سے زیادہ قابل نفرت چیز ہے۔ یہود و نصاریٰ کے معاملے میں، البتہ اتنی رعایت ہے کہ اُن کی پاک دامن عورتوں سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ شرک جیسی نجاست سے پوری طرح آلودہ ہونے کے باوجود وہ اصلاً توحید ہی کے ماننے والے ہیں۔

# حقوق و فرائض

خاندان کا ادارہ بھی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس طرح ہر ریاست اپنے قیام و بقا کے لیے ایک سربراہ کا تقاضا کرتی ہے، اِسی طرح یہ ریاست بھی ایک سربراہ کا تقاضا کرتی ہے۔ سربراہی کا مقام اِس ریاست میں مرد کو بھی دیا جا سکتا تھا اور عورت کو بھی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ مرد کی بعض خلقی صلاحیتوں کے پیش نظر یہ اُسے دیا گیا ہے اور اِس کے لازمی نتیجے کے طور پر عورتوں سے تقاضا کیا گیا ہے کہ اولاً، اُنھیں اپنے شوہروں کے ساتھ موافقت اور فرماں برداری کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ثانیاً، شوہر کے رازوں اور اُس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرنی چاہیے۔

عورت اگر شوہر کی اِس حیثیت کو چیلنج کر کے گھر کے نظام کو تلپٹ کر دینے پر آمادہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے گھر کو بچانے کے لیے مرد تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے:

پہلی یہ کہ عورت کو نصیحت کی جائے۔ قرآن میں اِس کے لیے 'وَعظ' کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کسی حد تک زجر و توبیخ بھی ہو سکتی ہے۔

دوسری یہ کہ اُس سے بے تکلفانہ قسم کا خلا ملا ترک کر دیا جائے تاکہ اُسے اندازہ ہو کہ اُس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اِس کے نتائج غیر معمولی ہو سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ عورت کو جسمانی سزا دی جائے۔ یہ سزا اتنی ہی ہو سکتی ہے، جتنی کوئی معلم اپنے زیر تربیت شاگردوں کو یا کوئی باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے۔

یہ تینوں صورتیں ترتیب و تدریج کے ساتھ ہیں۔ یعنی پہلی کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری صورت اُسی وقت اختیار کرنی چاہیے، جب آدمی مطمئن ہو جائے کہ بات نہیں بنی اور اگلا قدم اٹھانے کے سوا چارہ نہیں رہا۔ شوہر کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے۔ اِس سے اصلاح ہو جائے تو عورت کے خلاف انتقام کی راہیں نہیں ڈھونڈنی چاہییں۔

بیوی اگر ناپسند بھی ہو تو اُس سے اپنا دیا دلایا واپس لینے کے لیے اُس کو ضیق میں ڈالنے اور تنگ کرنے کی کوشش کسی بندۂ مومن کے لیے جائز نہیں ہے۔ اِس طرح کا رویہ صرف اُس صورت میں گوارا کیا جا سکتا ہے، جب وہ کھلی ہوئی بدکاری کرنے لگے۔ اِس قسم کی کوئی چیز اگر اُس سے صادر نہیں ہوئی ہے، وہ اپنی وفاداری پر قائم ہے اور پاک دامنی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے تو محض اِس بنیاد پر کہ بیوی پسند نہیں ہے، اُس کو تنگ کرنا عدل و انصاف اور فتوت و شرافت کے بالکل منافی ہے۔ اخلاقی فساد، بے شک قابل نفرت چیز ہے، لیکن محض صورت کے ناپسند ہونے یا کسی ذوقی عدم مناسبت کی بنا پر اُسے شریفانہ معاشرت کے حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ناپسندیدگی کے باوجود اُس کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا چاہیے جو شریفوں کے شایان شان ہو، عقل و فطرت کے مطابق ہو، رحم و مروت پر مبنی ہو اور اُس میں عدل و انصاف کے تقاضے ملحوظ رہے ہوں۔

# تعدد ازواج

انسان کی تخلیق جس فطرت پر ہوئی ہے، اُس کی رو سے خاندان کا ادارہ اپنی اصلی خوبیوں کے ساتھ ایک ہی مرد وعورت میں رشتۂ نکاح سے قائم ہوتا ہے۔ یہ تمدن کی ضروریات اور انسان کے نفسی، سیاسی اور سماجی مصالح ہیں جن کی بنا پر تعدد ازواج کا رواج کم یا زیادہ، ہر معاشرے میں رہا ہے اور اِنھی کی رعایت سے اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کسی شریعت میں اِسے ممنوع قرار نہیں دیا۔ تاہم یتیموں کی مصلحت کے پیش نظر جب قرآن نے اِس رواج سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی ہے تو اِس کے ساتھ یہ دو شرطیں بھی اِس پر عائد کر دی ہیں:

ایک یہ کہ یتیموں کے حقوق جیسی مصلحت کے لیے بھی عورتوں کی تعداد کسی شخص کے نکاح میں چار سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

دوسری یہ کہ بیویوں کے درمیان انصاف کی شرط ایک ایسی اٹل شرط ہے کہ آدمی اگر اِسے پورا نہ کر سکتا ہو تو اِس طرح کی کسی اہم دینی مصلحت کے پیش نظر بھی ایک سے زیادہ نکاح کرنا اُس کے لیے جائز نہیں ہے۔

تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ظاہر کے برتاؤ اور دل کے لگاؤ میں کسی پہلو سے کوئی فرق باقی نہ رہے۔ اِس طرح کا انصاف کسی کی طاقت میں نہیں ہے اور کوئی شخص یہ کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔ دل کے میلان پر آدمی کو اختیار نہیں ہوتا، لہٰذا اتنا کافی ہے کہ

شوہر ایک بیوی کی طرف اِس طرح نہ جھک جائے کہ دوسری بالکل معلق ہو کر رہ جائے۔

نکاح یتیموں کے حقوق کی نگہداشت کے لیے کیا گیا ہو یا کسی اور مقصد سے، مہر اور عدل عورت کا حق ہے اور یہ نہایت خوش دلی کے ساتھ ادا ہونا چاہیے، لیکن اگر اندیشہ ہو کہ بیویوں میں برابری کے حقوق پر اصرار کے نتیجے میں شوہر بیوی سے بے پروائی برتے گا یا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے گا تو اِس میں حرج نہیں کہ دونوں مل کر آپس میں کوئی سمجھوتا کرلیں۔

## مباشرت کے حدود

حیض و نفاس کے دنوں میں میاں بیوی کا جنسی تعلق ممنوع ہے۔ یہ پابندی خون کے بند ہو جانے تک ہے، اِس کے بعد یہ باقی نہیں رہتی، لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب عورت نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کرلے، تب اُس سے ملاقات کی جائے اور لازماً اُسی راستے سے کی جائے جو اللہ نے اِس کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔

## ایلا

بیوی سے ازدواجی تعلق منقطع کر لینا کسی عذر معقول کے بغیر جائز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر اِس کے لیے قسم بھی کھالی گئی ہے تو اُسے توڑ دینا ضروری ہے۔ اِس کے لیے چار مہینے کی مدت مقرر ہے۔ شوہر پابند ہے کہ اِس کے اندر یا تو بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کرلے یا طلاق دینے کا فیصلہ ہے تو اُس کو طلاق دے دے۔

## ظہار

اگر کوئی شخص منہ پھوڑ کر بیوی کو ماں سے یا اُس کے کسی عضو کو ماں کے کسی عضو سے تشبیہ دیتا ہے تو اِس سے بیوی ماں نہیں ہو جاتی اور نہ اُس کو وہ حرمت حاصل ہو سکتی ہے جو ماں کو حاصل ہے۔ لہٰذا اِس طرح کی تشبیہ سے نہ کسی کا نکاح ٹوٹتا ہے اور نہ اُس کی بیوی اُس کے لیے ماں کی طرح حرام ہو جاتی ہے۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُسے بغیر کسی تنبیہ کے چھوڑ دیا جائے۔ انسان کی معاشرتی زندگی پر اِس طرح کی باتوں کے اثرات بڑے غیر معمولی ہوتے ہیں، اِس وجہ سے ضروری ہے کہ اُس کی تادیب کی جائے تاکہ آیندہ وہ بھی احتیاط کرے اور دوسروں کو بھی اِس سے سبق حاصل ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے اُسے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ کفارہ درج ذیل ہے:

ایک لونڈی یا غلام آزاد کیا جائے۔

وہ میسر نہ ہو تو پے درپے دو مہینے کے روزے رکھے جائیں۔

یہ بھی نہ ہو سکے تو ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔

## طلاق

میاں بیوی میں نباہ نہ ہو سکے تو انبیا علیہم السلام کے دین میں علیحدگی کی گنجایش ہمیشہ رہی ہے۔ اصطلاح میں اِسے طلاق کہا جاتا ہے۔ اِس کی نوبت پہنچنے سے پہلے

ہر شخص کی خواہش ہونی چاہیے کہ جو رشتہ ایک مرتبہ قائم ہو گیا ہے، اُسے ممکن حد تک ٹوٹنے سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اصلاح کی تمام ممکن تدابیر اختیار کر لینے کے بعد بھی اگر صورت حال بہتر نہیں ہوتی اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ رشتہ قائم نہ رہ سکے گا تو طلاق سے پہلے آخری تدبیر کے طور پر اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے قبیلہ، برادری اور اُن کے رشتہ داروں اور خیر خواہوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر معاملات کو سدھارنے کی کوشش کریں۔ اس کی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ ایک حکم میاں اور ایک بیوی کے خاندان میں سے منتخب کیا جائے اور وہ دونوں مل کر اُن میں صلح کرائیں۔ اِس سے توقع ہے کہ جس جھگڑے کو فریقین خود طے کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، وہ خاندان کے بزرگوں اور دوسرے خیر خواہوں اور ہمدردوں کی مداخلت سے طے ہو جائے۔

مرد خاندان کا سربراہ ہے، پھر نان و نفقہ اور دوسرے اخراجات کی ذمہ داری بھی اُسی پر ہے، اِس لیے طلاق کا حق بھی اُسے ہی دیا گیا ہے۔ چنانچہ عورت اگر علیحدگی چاہے تو وہ طلاق دے گی نہیں، بلکہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ عام حالات میں توقع یہی ہے کہ ہر شریف النفس آدمی نباہ کی کوئی صورت نہ پا کر یہ مطالبہ مان لے گا، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو عورت عدالت سے رجوع کر سکتی ہے جو شوہر کو طلاق دینے کا حکم دے گی یا فسخ نکاح کا فیصلہ کر دے گی۔

شوہر خود طلاق دے یا بیوی کے مطالبے پر اُسے علیحدہ کر دینے کا فیصلہ کرے،

دونوں ہی صورتوں میں اِس کا جو طریقہ قرآن میں بتایا گیا ہے، وہ درج ذیل ہے:

۱۔ طلاق عدت کے لحاظ سے دی جائے گی۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو فوراً علیحدہ کر دینے کے لیے طلاق دینا جائز نہیں ہے۔ یہ جب دی جائے گی، ایک متعین مدت کے پورا ہو جانے پر مفارقت کے ارادے سے دی جائے گی۔ عدت کا لفظ اصطلاح میں اُس مدت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں بیوی شوہر کی طرف سے طلاق یا اُس کی وفات کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔ یہ مدت چونکہ اصلاً مقرر ہی اِس لیے کی گئی ہے کہ عورت کے پیٹ کی صورت حال پوری طرح واضح ہو جائے، اِس لیے ضروری ہے کہ بیوی کو حیض سے فراغت کے بعد اور اُس سے زن و شو کا تعلق قائم کیے بغیر طلاق دی جائے۔

۲۔ عدت کا شمار پوری احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے۔ طلاق کا معاملہ نہایت نازک ہے، اِس سے عورت اور مرد اور اُن کی اولاد اور اُن کے خاندان کے لیے بہت سے قانونی مسائل پیدا ہوتے ہیں، اِس لیے ضروری ہے کہ جب طلاق دی جائے تو اُس کے وقت اور تاریخ کو یاد رکھا جائے اور یہ بھی یاد رکھا جائے کہ طلاق کے وقت عورت کی حالت کیا تھی، عدت کی ابتدا کس وقت ہوئی ہے، یہ کب تک باقی رہے گی اور کب ختم ہو جائے گی۔

۳۔ عدت کے پورا ہونے تک شوہر کو رجوع کا حق ہے۔ شوہر رجوع نہ کرے تو عدت کے پورا ہو جانے پر میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ خاتمے کو پہنچ

رہی ہو تو شوہر کو فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اُسے بیوی کو روکنا ہے یا رخصت کر دینا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں اللہ کا حکم ہے کہ معاملہ معروف کے مطابق، یعنی بھلے طریقے سے کیا جائے۔ اِس باب میں جو ہدایات خود قرآن میں دی گئی ہیں، وہ یہ ہیں:

اولاً، بیوی کو کوئی مال، جایداد، زیورات اور ملبوسات وغیرہ، خواہ کتنی ہی مالیت کے ہوں، اگر تحفے کے طور پر دیے گئے ہیں تو اُن کا واپس لینا جائز نہیں ہے۔ نان ونفقہ اور مہر تو عورت کا حق ہے، اُن کے واپس لینے یا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِن کے علاوہ جو چیزیں دی گئی ہوں، اُن کے بارے میں بھی قرآن کا حکم ہے کہ وہ ہرگز واپس نہیں لی جاسکتیں۔

اِس سے دو صورتیں، البتہ مستثنیٰ ہیں:

ایک یہ کہ میاں بیوی میں حدودالٰہی کے مطابق نباہ ممکن نہ رہے، معاشرے کے ارباب حل وعقد بھی یہی محسوس کریں، لیکن میاں صرف اِس لیے طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو کہ اُس کے دیے ہوئے اموال بھی ساتھ ہی جائیں گے تو بیوی یہ اموال یا اِن کا کچھ حصہ واپس کر کے شوہر سے طلاق لے سکتی ہے۔ اِس طرح کی صورت حال اگر کبھی پیدا ہو جائے تو شوہر کے لیے اُسے لینا ممنوع نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ بیوی کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کرے۔ اِس سے میاں بیوی کے رشتے کی بنیاد ہی چونکہ منہدم ہو جاتی ہے، لہٰذا شوہر کے لیے جائز ہے کہ اِس صورت میں وہ اپنا دیا ہوا مال اُس سے واپس لے لے۔

ثانیاً، عورت کو ہاتھ لگانے یا اُس کا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دی جائے تو مہر کے معاملے میں شوہر پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن مہر مقرر ہو اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق کی نوبت پہنچ جائے تو مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا ہو گا، اِلّا یہ کہ عورت اپنی مرضی سے پورا چھوڑ دے یا مرد پورا ادا کر دے۔

ثالثاً، عورت کو کچھ سامان زندگی دے کر رخصت کیا جائے۔ قرآن نے اسے اللہ سے ڈرنے والوں اور احسان کا رویہ اختیار کرنے والوں پر ایک حق قرار دیا ہے۔ اِس کی مقدار سوسائٹی کے دستور اور مرد کے معاشی حالات کی رعایت سے متعین کی جائے گی۔ طلاق اگر عورت کو ہاتھ لگائے بغیر یا مہر مقرر کیے بغیر بھی دی گئی ہے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ حق ادا ہونا چاہیے۔

۴۔ عدت کے دوران میں شوہر رجوع کر لے تو عورت بدستور اُس کی بیوی رہے گی۔ طلاق اور طلاق کے بعد رجوع کا یہ حق ہر شخص کو ایک رشتۂ نکاح میں دو مرتبہ حاصل ہے۔ اِس کے بعد یہ حق باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ایک رشتۂ نکاح میں دو مرتبہ رجوع کے بعد تیسری مرتبہ پھر علیحدگی کی نوبت آ گئی اور شوہر نے طلاق دے دی تو اِس کے نتیجے میں عورت ہمیشہ کے لیے اُس سے جدا ہو جائے گی، اِلّا یہ کہ اُس کا نکاح کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہو اور وہ بھی اُسے طلاق دے دے۔

۵۔ شوہر طلاق دے یا رجوع کرے، دونوں ہی صورتوں میں اُسے چاہیے کہ اپنے اِس فیصلے پر دو ثقہ مسلمانوں کو گواہ بنا لے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ فریقین میں سے

کوئی بعد میں کسی بات کا انکار نہ کرے اور اگر کوئی نزاع پیدا ہو تو اُس کا فیصلہ آسانی کے ساتھ ہو جائے۔

۶۔ طلاق کی عدت عام حالات میں تین حیض اور حمل کی صورت میں وضع حمل ہے۔ عورت حیض سے مایوس ہو چکی ہو یا حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود اُسے حیض نہ آیا ہو تو یہ عدت تین مہینے ہو گی۔ عورت غیر مدخولہ ہو تو اُس کے متعلق چونکہ حمل کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اِس لیے اُس کی کوئی عدت بھی نہیں ہے۔

زمانۂ عدت کے جو احکام قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں:

اولاً، ہدایت کی گئی ہے کہ اِس دوران میں نہ بیوی کو اپنا گھر چھوڑنا چاہیے اور نہ شوہر کو یہ حق ہے کہ اُس کے گھر سے اُسے نکال دے۔ اِس طرح اکٹھا رہنے کے نتیجے میں توقع ہے کہ دلوں میں تبدیلی پیدا ہو جائے، دونوں اپنے رویے کا جائزہ لیں اور اُن کا اجڑتا ہوا گھر ایک مرتبہ پھر آباد ہو جائے۔ اِس سے مستثنیٰ صرف یہ صورت ہے کہ مرد نے عورت کو طلاق ہی کسی کھلی بدکاری کے ارتکاب پر دی ہو۔ اِس صورت میں، ظاہر ہے کہ نہ شوہر سے یہ مطالبہ کرنا جائز ہے کہ وہ ایسی عورت کو گھر میں رہنے دے، اور نہ اِس سے وہ فائدہ ہی حاصل ہو سکتا ہے جس کے لیے یہ ہدایت کی گئی ہے۔

ثانیاً، فرمایا ہے کہ عدت کے دوران میں وہ عورت کو اپنی حیثیت کے مطابق رہنے کی جگہ اور نان و نفقہ فراہم کرے گا اور اِس عرصے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرے گا جس سے اُس کی خودداری مجروح ہو اور وہ چند ہی دنوں میں پریشان ہو کر اُس کا گھر

چھوڑنے کے لیے مجبور ہو جائے۔

ثالثاً، زمانۂ عدت میں عورت اپنا حمل چھپانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت سختی کے ساتھ اِس کی تاکید فرمائی ہے، اِس لیے کہ عدت کا حکم دیا ہی اس لیے گیا ہے کہ عورت کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہو جائے۔

۷۔ طلاق کے بعد بھی اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت اُس کے بچے کو دودھ پلائے تو اُسے دو سال تک یہ ذمہ داری پوری کرنی چاہیے۔ عورت اِس کے لیے آمادہ ہو تو مرد اُسے اِس خدمت کا معاوضہ ادا کرے گا اور یہ معاوضہ باہمی مشورے سے اور بھلے طریقے سے طے کیا جائے گا۔ بچے کا باپ وفات پا چکا ہو تو بعینہٖ یہی پوزیشن مذکورہ ذمہ داریوں اور حقوق کے معاملے میں اُس کے وارث کی ہو گی۔ فریقین یہ مدت کم بھی کر سکتے ہیں اور بچے کا باپ یا اُس کے ورثہ ماں کی جگہ کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہیں تو اِس کی بھی اجازت ہے، بشرطیکہ اُس کی ماں سے دینے دلانے کی جو قرارداد ہوئی ہے، وہ پوری کر دی جائے۔

۸۔ طلاق کے بعد عورت کے کسی فیصلے میں رکاوٹ بننے کا حق پہلے شوہر کے لیے باقی نہیں رہتا۔ وہ جب چاہے اور جہاں چاہے، شادی کر سکتی ہے۔ اُس کا یہ فیصلہ اگر دستور کے مطابق ہے تو اِس پر کسی اعتراض کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔

## شوہر کی وفات

بیوہ کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ عام مطلقہ کی نسبت سے یہ اضافہ اِس لیے ہوا

ہے کہ اُس کو تو ایسے طہر میں طلاق دینے کی ہدایت کی گئی ہے جس میں شوہر سے اُس کی ملاقات نہ ہوئی ہو، لیکن بیوہ کے لیے اِس طرح کا کوئی ضابطہ بنانا چونکہ ممکن نہیں ہے، اِس لیے احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ دن بڑھا دیے جاتے۔

مطلقہ اور بیوہ کے لیے عدت کا حکم چونکہ ایک ہی مقصد سے دیا گیا ہے، اِس لیے جو مستثنیات طلاق کے لیے بیان ہوئے ہیں، وہ بیوہ کی عدت میں بھی اِسی طرح ملحوظ ہوں گے۔ چنانچہ بیوہ غیر مدخولہ کے لیے کوئی عدت نہیں ہوگی اور حاملہ کی عدت وضع حمل کے بعد ختم ہو جائے گی۔

عدت گزرنے کے بعد عورت آزاد ہے اور اپنے معاملے میں جو قدم مناسب سمجھے، اٹھا سکتی ہے۔ معاشرے کے دستور کی پابندی، البتہ اُسے کرنی چاہیے، یعنی کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے متعلق خاندانوں کی عزت، شہرت، وجاہت اور اچھی روایات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ ملحوظ رہے تو اُس پر یا اُس کے اولیا پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص بیوہ سے نکاح کرنا چاہتا ہو تو عدت کے دوران میں وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ اپنے دل میں اِس کا ارادہ کر لے یا اشارے کنایے میں کوئی بات منہ سے نکال دے، لیکن اُس کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ ایک غم زدہ خاندان کے جذبات کا لحاظ کیے بغیر عورت کو نکاح کا پیغام بھیجے یا کوئی خفیہ عہد و پیمان کرے۔

شوہروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیواؤں کے لیے ایک سال کے نان و نفقہ

اور اپنے گھروں میں سکونت کی وصیت کر جائیں، الّا یہ کہ وہ خود اپنی مرضی سے شوہر کا گھر چھوڑ دیں یا اس نوعیت کا کوئی دوسرا قدم اٹھالیں۔

## مرد و زن کا اختلاط

نکاح کے ادارے کی حفاظت اور باہمی تعلقات میں دلوں کی پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اختلاط مرد و زن کے آداب مقرر فرمائے ہیں۔

یہ آداب درج ذیل ہیں:

ا۔ ایک دوسرے کے گھروں میں جانے کی ضرورت پیش آ جائے تو بے دھڑک اور بے پوچھے اندر داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ اِس طرح کے موقعوں پر ضروری ہے کہ آدمی پہلے گھر والوں کو اپنا تعارف کرائے، جس کا شایستہ اور مہذب طریقہ یہ ہے کہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کیا جائے۔ اِس سے گھر والے معلوم کر لیں گے کہ آنے والا کون ہے، کیا چاہتا ہے اور اُس کا گھر میں داخل ہونا مناسب ہے یا نہیں۔ اِس کے بعد اگر وہ سلام کا جواب دیں اور اجازت ملے تو گھر میں داخل ہو، اجازت دینے کے لیے گھر میں کوئی موجود نہ ہو یا موجود ہو اور اُس کی طرف سے کہہ دیا جائے کہ اِس وقت ملنا ممکن نہیں ہے تو دل میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر واپس چلا جائے۔

اِس سے ربط و تعلق کے لوگوں کو سہارے سے محروم کرنا یا اُن کی سوشل آزادیوں پر پابندی لگانا مقصود نہیں ہے، اِس لیے لوگ خود ہوں یا اُن کے مجبور و معذور اعزہ و احباب جو اُنھی کے گھروں پر گزارہ کرتے ہیں، اُن کے لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ

ایک دوسرے کے گھروں میں آئیں جائیں، ملیں جلیں اور مرد وعورت الگ الگ یا اکٹھے بیٹھ کر کھائیں پئیں، نہ اُن کے اپنے گھروں میں کوئی حرج ہے، نہ باپ دادا کے گھروں میں، نہ ماؤں کے گھروں میں، نہ بھائیوں اور بہنوں کے گھروں میں، نہ چچاؤں، پھوپھیوں، ماموؤں اور خالاؤں کے گھروں میں، نہ زیرتولیت افراد کے گھروں میں اور نہ دوستوں کے گھروں میں۔ اتنی بات، البتہ ضروری ہے کہ گھروں میں داخل ہوں تو اپنے لوگوں کو سلام کریں۔

۲۔ اُن جگہوں کے لیے یہ پابندی ضروری نہیں ہے جہاں لوگوں کے بیوی بچے نہ رہتے ہوں۔ یعنی ہوٹل، سرائے، مہمان خانے، دکانیں، دفاتر، مردانہ نشست گاہیں وغیرہ۔ اِسی طرح گھروں میں آمدورفت رکھنے والے خادموں اور نابالغ بچوں کے لیے بھی ہر موقع پر اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔ اُن کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ تین اوقات میں اجازت لے کر داخل ہوں: نماز فجر سے پہلے جبکہ لوگ ابھی بستروں میں ہوتے ہیں؛ ظہر کے وقت جب وہ قیلولہ کے لیے کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہیں اور عشا کے بعد جب وہ سونے کے لیے بستروں میں چلے جاتے ہیں۔ اِن کے سوا دوسرے اوقات میں نابالغ بچے اور گھر کے خدام عورتوں اور مردوں کے پاس، اُن کے تخلیے کی جگہوں میں اور اُن کے کمروں میں اجازت لیے بغیر آسکتے ہیں۔ نابالغ بچوں کے لیے، البتہ بالغ ہو جانے کے بعد یہ رخصت باقی نہ رہے گی۔ بلوغ کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد اُن کے لیے بھی ضروری ہوگا کہ عام قانون کے مطابق اجازت لے کر گھروں میں داخل ہوں۔

۳۔ اِن مقامات پر اگر عورتیں موجود ہوں تو اللہ کا حکم ہے کہ مرد بھی اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور عورتیں بھی۔ نگاہوں میں حیا ہو اور مرد و عورت ایک دوسرے کے حسن و جمال سے آنکھیں سینکنے، خط و خال کا جائزہ لینے اور ایک دوسرے کو گھورنے سے پرہیز کریں تو اِس حکم کا منشا یقیناً پورا ہو جاتا ہے، اِس لیے کہ اِس سے مقصود نہ دیکھنا یا ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہنا نہیں ہے، بلکہ نگاہ بھر کر نہ دیکھنا اور نگاہوں کو دیکھنے کے لیے بالکل آزاد نہ چھوڑ دینا ہے۔

۴۔ اِس طرح کے موقعوں پر شرم گاہوں کی حفاظت کی جائے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ نہ اُن کے اندر دوسروں کے لیے کوئی میلان ہو اور نہ وہ اُن کے سامنے کھولی جائیں، بلکہ عورتیں اور مرد ایک جگہ موجود ہوں تو چھپانے کی جگہوں کو اور بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ چھپا کر رکھا جائے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ بڑا دخل اِس چیز کو ہے کہ لباس باقرینہ ہو۔ عورتیں اور مرد، دونوں ایسا لباس پہنیں جو زینت کے ساتھ صنفی اعضا کو بھی پوری طرح چھپانے والا ہو۔ پھر ملاقات کے موقع پر اِس بات کا خیال رکھا جائے کہ اٹھنے بیٹھنے میں کوئی شخص برہنہ نہ ہونے پائے۔

۵۔ عورتوں کے لیے خاص طور پر ضروری ہے کہ وہ زیب و زینت کی کوئی چیز اپنے محرم اعزہ اور متعلقین کے سوا کسی شخص کے سامنے ظاہر نہ ہونے دیں۔ اِس سے زیبایش کی وہ چیزیں، البتہ مستثنیٰ ہیں جو عادتاً کھلی ہوتی ہیں۔ یعنی ہاتھ پاؤں اور چہرے کا بناؤ سنگھار اور زیورات وغیرہ۔ اِن اعضا کے سوا باقی ہر جگہ کی زیبایش عورتوں کو چھپانی

چاہیے اور اس کے لیے اپنی اوڑھنیوں کے آنچل اپنے گریبانوں پر ڈال کر رکھنے چاہییں، یہاں تک کہ مردوں کی موجودگی میں اپنے پاؤں زمین پر مار کر چلنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے تاکہ اُن کی چھپی ہوئی زینت ظاہر نہ ہو جائے۔

۶۔ سینہ اور گریبان ڈھانپ کر رکھنے کا جو حکم اوپر بیان ہوا ہے، وہ اُن بڑی بوڑھیوں کے لیے نہیں ہے جو اب نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں، بشرطیکہ وہ زینتوں کی نمایش کرنے والی نہ ہوں۔ تاہم پسندیدہ بات اُن کے لیے بھی یہی ہے کہ احتیاط کریں اور مردوں کی موجودگی میں دوپٹا نہ اتاریں۔ یہ اُن کے لیے بہتر ہے۔

## والدین

نکاح سے جو رشتے پیدا ہوتے ہیں، اُن میں اہم ترین رشتہ والدین کا ہے۔ اِن کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم تمام الہامی صحائف میں دی گئی ہے۔ اِس کے جو حدود قرآن نے متعین فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ اپنے پروردگار کے بعد انسان کو سب سے بڑھ کر اپنے ماں باپ کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ یہ شکر محض زبان سے ادا نہیں ہوتا، اِس کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی اُن کے ساتھ انتہائی احترام سے پیش آئے، اُن کے خلاف دل میں کوئی بے زاری نہ پیدا ہونے دے، اُن کے سامنے سوء ادب کا کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالے، بلکہ نرمی، محبت، شرافت اور سعادت مندی کا اسلوب اختیار کرے۔ اُن کی بات مانے اور بڑھاپے

کی ناتوانیوں میں اُن کی دل داری اور تسلی کرتا رہے۔

۲۔ والدین کی اِس حیثیت کے باوجود یہ حق اُن کو حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنانے کے لیے اولاد پر دباؤ ڈالیں۔ اِس معاملے میں اولاد کو اُن کی اطاعت سے صاف انکار کر دینا چاہیے اور پیروی ہر حال میں اُنھی لوگوں کے طریقے کی کرنی چاہیے جو خدا کی طرف متوجہ ہیں۔ خدا سے انحراف کی دعوت والدین بھی دیں تو قبول نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام و ہدایات بھی اِسی کے تحت سمجھے جائیں گے اور والدین کے کہنے سے اُن کی خلاف ورزی بھی کسی کے لیے جائز نہ ہوگی۔

۳۔ شرک جیسے گناہ پر اصرار کے باوجود دنیا کے معاملات میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ دستور کے مطابق اِسی طرح قائم رہنا چاہیے۔ اُن کی ضروریات حتی المقدور پوری کرنے کی کوشش کی جائے اور اُن کے لیے ہدایت کی دعا بھی برابر جاری رہے۔ دین و شریعت کا معاملہ الگ ہے، مگر اِس طرح کی چیزوں میں اولاد سے ہرگز کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

## یتامیٰ

بچے باپ سے محروم ہو جائیں تو اُن کے معاملات سے متعلق چند متعین ہدایات قرآن میں دی گئی ہیں۔ اِن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ یتیموں کے سرپرست اُن کا مال اُن کے حوالے کریں، اُسے خود ہضم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ظلم و ناانصافی سے یتیم کا مال ہڑپ کرنا گویا اپنے پیٹ میں آگ بھرنا

ہے۔ لہٰذا کوئی شخص نہ اپنا برا مال اُن کے اچھے مال سے بدلنے کی کوشش کرے اور نہ انتظامی سہولت کی نمایش کرکے اُس کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھانے کے مواقع پیدا کرے۔ اِس طرح کا اختلاط اگر کسی وقت کیا جائے تو یہ خورد برد کے لیے نہیں، بلکہ اُن کی بہبود اور اُن کے معاملات کی اصلاح کے لیے ہونا چاہیے۔

۲۔ یتیموں کے مال کی حفاظت اور اُن کے حقوق کی نگہداشت ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ لوگوں کے لیے تنہا اِس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو اور وہ یہ سمجھتے ہوں کہ یتیم کی ماں کو اُس میں شامل کرکے وہ اپنے لیے سہولت پیدا کر سکتے ہیں تو اُنھیں چاہیے کہ اُن کی ماؤں میں سے جو اُن کے لیے جائز ہوں، اُن میں سے دو دو، تین تین، چار چار کے ساتھ نکاح کر لیں۔ لیکن یہ اجازت صرف اُس صورت میں ہے، جب بیویوں کے درمیان عدل قائم رکھنا ممکن ہو۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ وہ اِس میں کامیاب نہ ہو سکیں گے تو پھر یتیموں کی بہبود جیسے نیک مقصد کے لیے بھی ایک سے زیادہ نکاح نہ کریں۔ انصاف پر قائم رہنے کے لیے یہی طریقہ زیادہ صحیح ہے۔ اِس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اِن عورتوں کا مہر اُسی طریقے سے دیا جائے جس طرح عام عورتوں کو دیا جاتا ہے۔ یہ عذر نہیں پیدا کرنا چاہیے کہ نکاح چونکہ اُنھی کی اولاد کی مصلحت سے کیا گیا ہے، اِس لیے اب کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہی۔ ہاں، اگر اپنی خوشی سے وہ مہر کا کوئی حصہ معاف کر دیں یا کوئی اور رعایت کریں تو اِس میں حرج نہیں ہے۔ لوگ اگر چاہیں تو اُس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۳۔ یتیموں کا مال اُن کے حوالے کر دینے کی جو ہدایت کی گئی ہے، اُس پر عمل اُسی

وقت کیا جائے، جب وہ اپنا مال سنبھال لینے کی عمر کو پہنچ جائیں۔ اس سے پہلے ضروری ہے کہ یہ سرپرستوں کی حفاظت اور نگرانی میں رہے اور وہ یتیموں کو جانچتے رہیں کہ اُن کے اندر معاملات کی سوجھ بوجھ اور اپنی ذمہ داریوں کو اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے یا نہیں۔ اِس دوران میں اُن کی ضروریات، البتہ فراخی کے ساتھ پوری کی جائیں۔ اِس اندیشے سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے، اُن کا مال جلدی جلدی اڑانے کی کوشش نہ کی جائے اور بات چیت میں اُن کی دل داری کا خیال رکھا جائے۔

۴۔ سرپرست اگر مستغنی ہو تو اپنی اِس خدمت کے عوض اُسے کچھ لینا نہیں چاہیے، لیکن غریب ہو تو یتیم کے مال سے اپنا حق خدمت دستور کے مطابق لے سکتا ہے۔

۵۔ مال حوالے کیا جائے تو اُس پر کچھ ثقہ اور معتبر لوگوں کو گواہ بنا لینا چاہیے تاکہ کسی سوء ظن اور اختلاف و نزاع کا احتمال باقی نہ رہے۔ پھر یاد رکھنا چاہیے کہ ایک دن یہی حساب اللہ تعالیٰ کو بھی دینا ہے اور وہ سمیع و علیم ہے، اُس سے کوئی چیز چھپائی نہیں جا سکتی۔

۶۔ مرنے والے کے ترکے میں وارثوں کے حصے اگرچہ متعین ہیں، لیکن تقسیم وراثت کے موقع پر قریبی اعزہ اور یتامیٰ و مساکین آ جائیں تو اِس سے قطع نظر کہ قانونی لحاظ سے اُن کا کوئی حق بنتا ہے یا نہیں، اُنھیں کچھ دے دلا کر اور اچھی بات کہہ کر رخصت کرنا چاہیے۔ اِس طرح کے موقعوں پر یہ بات ہر شخص کو یاد رکھنی چاہیے کہ اُس کے بچے بھی یتیم ہو سکتے ہیں اور وہ بھی اِسی طرح اُنھیں دوسروں کی نگاہ التفات کا محتاج چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو سکتا ہے۔

---

۳

# قانونِ سیاست

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے، اُس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ وہ تمدن کو چاہتا ہے اور پھر اِس تمدن کو اپنے ارادہ و اختیار کے سوء استعمال سے بچانے کے لیے جلد یا بدیر اپنے اندر ایک نظم اجتماعی پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انسانی تاریخ میں سیاست و حکومت، انسان کی اِس خواہش اور اِس مجبوری ہی کے بطن سے پیدا ہوئی ہے اور انسان جب تک انسان ہے، وہ اگر چاہے بھی تو اِس سے نجات حاصل کر لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، لہٰذا عقل کا تقاضا یہی ہے کہ اِس دنیا میں حکومت کے بغیر کسی معاشرے اور تمدن کا خواب دیکھنے کے بجائے وہ اپنے اِس نظم اجتماعی کو زیادہ سے زیادہ پاکیزہ بنانے کی کوشش کرے۔

الہامی صحائف کے علما جانتے ہیں کہ دنیا میں دو خطہ ہاے ارض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کیے تھے: ایک فلسطین اور دوسرے جزیرہ نماے عرب۔ یہ اِس لیے خاص کیے گئے کہ عالمی سطح پر دین کی شہادت کے لیے اللہ تعالیٰ کی منتخب کردہ قومیں اِن

خطہ ہاے ارض میں اُس کی توحید کے مراکز قائم کریں۔ یہ مراکز مکہ اور یروشلم میں دو مسجدوں کی صورت میں قائم کیے گئے جنھیں 'بیت الحرام' اور 'ہیکل سلیمانی' کہا جاتا ہے۔ اِن مراکز کی حفاظت اور اِن کے ذریعے سے دین کی دعوت اقصاے عالم تک پہنچانے کے لیے فیصلہ کیا گیا کہ اِن خطہ ہاے ارض میں کسی دوسرے دین کے ماننے والے مستقل طور پر کبھی آباد نہیں ہوں گے۔ اِس کا لازمی نتیجہ وہاں اُن قوموں کی حکومت تھی جو اِس مقصد کے لیے منتخب کی گئیں۔ اِس حکومت کا نظم تاریخ میں بارہا خود پروردگار عالم کے ہاتھ میں رہا ہے۔ آخری مرتبہ یہ واقعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ رسالت میں ہوا۔ چنانچہ یہی موقع ہے جب خدا کی اِس حکومت کے لیے سیاست کا ایک قانون قرآن مجید میں نازل کیا گیا جس کے بعض پہلوؤں کی وضاحت خدا کے آخری پیغمبر نے فرمائی۔ نظم اجتماعی کی تطہیر کے لیے یہ ایک رہنما قانون ہے اور درج ذیل پانچ دفعات پر مبنی ہے:

## ۱۔ بنیادی اصول

اللہ و رسول نے جن معاملات میں کوئی حکم ہمیشہ کے لیے دے دیا ہے، اُن میں مسلمانوں کے اولی الامر کو، خواہ وہ ریاست کے سربراہ ہوں یا پارلیمان کے ارکان، اب اپنی طرف سے کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان اپنی ریاست میں کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتے جو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف ہو یا جس میں اُن کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ اِس کے تحت، البتہ وہ پابند ہیں کہ

اولی الامر کی طرف سے جو حکم بھی دیا جائے، اُسے پوری توجہ سے سنیں اور مانیں۔

## ۲۔ اصل ذمہ داری

اِس اصول کی بنیاد پر جو نظم اجتماعی قائم ہوگا، اُس کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ قوم کی امانتیں اہلیت (merit) کی بنیاد پر لوگوں کے سپرد کرے اور عدل وانصاف کو زندگی کے ہر شعبے میں اور اُس کی آخری صورت میں قائم کر دینے کی جدوجہد کرتا رہے۔

## ۳۔ دینی فرائض

نماز قائم کی جائے، زکوٰۃ ادا کی جائے، بھلائی کی تلقین کی جائے اور برائی سے روکا جائے، یہ نظم اجتماعی کے دینی فرائض ہیں۔ اِنھیں پورا کرنے کے لیے جو ہدایات قرآن وسنت میں دی گئی ہیں، اُن کی رو سے:

ا۔ مسلمانوں کے ارباب حل وعقد خود بھی نماز کا اہتمام کریں گے اور اپنے عمال کو بھی اس کا پابند بنائیں گے۔

ب۔ نماز جمعہ اور نماز عیدین کا خطاب اور اُن کی امامت ہر جگہ یہی ارباب حل وعقد اور اِن کے مقرر کردہ حکام کریں گے۔

ج۔ مسلمانوں کے لیے زکوٰۃ ہی تنہا ٹیکس ہے، لہٰذا ہر وہ مسلمان جس پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہو، اپنے مال، مواشی اور پیداوار میں مقررہ حصہ اپنے سرمائے سے الگ کر کے لازماً حکومت کے حوالے کر دے گا اور حکومت دوسرے مصارف کے ساتھ اُس سے اپنے حاجت مند شہریوں کی ضرورتیں، اُن کی فریاد سے پہلے، اُن کے دروازے پر پہنچ کر

پوری کرنے کی کوشش کرے گی۔

د۔ بھلائی کی تلقین کرنے اور برائی سے روکنے کے لیے حکومت کی طرف سے کچھ لوگ باقاعدہ مقرر کیے جائیں گے جو اپنے لیے متعین کردہ حدود کے مطابق اِس کام کو انجام دینے کے لیے ہمہ وقت سرگرم عمل ہوں گے۔

## ۴۔ مسلمانوں کے حقوق

ریاست کے مسلمان شہری اگر نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کرتے رہیں تو وہ تمام حقوق اُنھیں حاصل ہو جائیں گے جو ایک مسلمان کی حیثیت سے اُن کی حکومت میں اُنھیں حاصل ہونے چاہییں۔ وہ آپس میں بھائی بھائی ہوں گے، قانونی حقوق کے لحاظ سے برابر ہوں گے، دین کے ایجابی تقاضوں میں سے نماز اور زکوٰۃ کے سوا کوئی چیز قانون کی طاقت سے اُن پر نافذ نہیں کی جائے گی اور نہ حکومت اُن کی جان، مال، آبرو اور عقل و راے کے خلاف کسی نوعیت کی کوئی تعدی کر سکے گی۔

## ۵۔ نظم حکومت

ریاست کے امرا و حکام کا انتخاب اور حکومت و امارت کا انعقاد لوگوں کی راے اور مشورے سے ہوگا اور امارت کا منصب سنبھال لینے کے بعد بھی وہ یہ اختیار نہیں رکھیں گے کہ اجتماعی معاملات میں مسلمانوں کے اجماع یا اکثریت کی راے کو رد کر دیں۔

۴

# قانون معیشت

تزکیۂ معیشت کا جو قانون اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر کی وساطت سے انسانیت کو دیا ہے، اُس کی بنا اِس اصول پر قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمایش کے لیے بنائی ہے۔ اِس وجہ سے اِس کا نظام اُس نے اِس طرح قائم کیا ہے کہ یہاں سب لوگ ایک دوسرے کے محتاج اور محتاج الیہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔ اِس دنیا میں اعلیٰ سے اعلیٰ شخصیتیں بھی اپنی ضرورتوں کے لیے دوسروں کی طرف رجوع کی محتاج ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ انسانوں کی طرف بھی اِن ضرورتوں کے لیے رجوع کیا جاتا ہے۔ یہاں ہر شخص کا ایک کردار ہے اور کوئی بھی دوسروں سے بے نیاز ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ عالم کے پروردگار نے یہاں ہر شخص کی ذہانت، صلاحیت، ذوق و رجحان اور ذرائع و وسائل میں بڑا تفاوت رکھا ہے۔ چنانچہ اِس تفاوت کے نتیجے میں جو معاشرہ وجود میں آتا ہے، اُس میں اگر ایک طرف وہ عالم اور حکیم پیدا ہوتے ہیں جن کی دانش سے دنیا روشنی حاصل کرتی ہے؛ وہ مصنف پیدا ہوتے ہیں جن کا قلم لفظ و

معنی کے رشتوں کو حیات ابدی عطا کرتا ہے؛ وہ محقق پیدا ہوتے ہیں جن کے نوادر تحقیق پر زمانہ داد دیتا ہے؛ وہ لیڈر پیدا ہوتے ہیں جن کی تدبیر و سیاست سے حیات اجتماعی کے عقدے کھلتے ہیں؛ وہ مصلح پیدا ہوتے ہیں جن کی سعی و جہد سے انسانیت خود اپنا شعور حاصل کرتی ہے اور وہ حکمران پیدا ہوتے ہیں جن کا عزم و استقلال تاریخ کا رخ بدل دیتا ہے تو دوسری طرف وہ مزدور اور دہقان اور وہ خادم اور قلی اور خاک روب بھی پیدا ہوتے ہیں جن کی محنت سے کلیں معجزے دکھاتی، مٹی سونا اگلتی، چولھے لذت کام و دہن کا سامان پیدا کرتے، گھر چاندی کی طرح چمکتے، راستے پاؤں لینے کے لیے بے تاب نظر آتے، عمارتیں آسمان کی خبر لاتی اور غلاظتیں صبح دم اپنا بستر سمیٹ لیتی ہیں۔

اِس فرق مراتب کے ساتھ دنیا کو پیدا کر کے عالم کا پروردگار یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ اعلیٰ و ادنیٰ، باہمی احترام اور باہم دگر تعاون سے صالح معاشرت اور صالح تمدن وجود میں لاتے ہیں یا ایک دوسرے کے خلاف اپنی شرارتوں اور حماقتوں سے اِس عالم کو سراسر فساد بنا دینے کی سعی میں مصروف ہو جاتے ہیں، اور اِس طرح دنیا میں بھی رسوا ہوتے اور آخرت میں بھی اُس کے عذاب کے مستحق ٹھیرتے ہیں۔

انسان کی یہی آزمایش ہے جس میں پورا اترنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے اُس کی رہنمائی فرمائی اور معاشی عمل میں اُس کے تزکیہ و تطہیر کے لیے اُسے اپنا ایک قانون دیا ہے۔

یہ قانون درج ذیل ہے:

## ۱۔ اکل الاموال بالباطل

دوسروں کا مال باطل طریقوں سے کھانا ممنوع ہے۔ سود اور جوا اس سلسلے کے بدترین جرائم ہیں۔ اِن کے علاوہ دوسرے تمام معاشی معاملات کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ بھی اِسی اصول کی روشنی میں کرنا چاہیے۔

## ۲۔ قومی املاک

وہ تمام اموال اور املاک جو کسی فرد کی ملکیت نہیں ہیں یا نہیں ہو سکتے، اُنھیں ریاست ہی کی ملکیت میں رہنا چاہیے تاکہ قوم کی یہ دولت دولت مندوں ہی میں گردش نہ کرے اور اِس کا فائدہ وہ لوگ بھی اٹھائیں جو اپنی ضرورتوں کے لیے دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں۔ اِسی طرح نظم اجتماعی سے متعلق بعض دوسری ذمہ داریاں بھی اِس سے پوری کی جاسکیں۔

## ۳۔ تحریر و شہادت

لین دین، قرض، وصیت اور اِس طرح کے دوسرے مالی امور میں تحریر و شہادت کا اہتمام ضروری ہے۔ اِس سے بے پروائی بعض اوقات بڑے اخلاقی فساد کا باعث بن جاتی ہے۔

اِس کے احکام یہ ہیں:

قرض کا لین دین ایک خاص مدت کے لیے ہو تو ضروری ہے کہ اُس کی دستاویز لکھ لی جائے۔

یہ دستاویز دونوں پارٹیوں کی موجودگی میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔

دستاویز لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے پر ہوگی۔ وہ دستاویز میں اعتراف کرے گا کہ میں فلاں بن فلاں کا اتنے کا قرض دار ہوں۔

اگر یہ شخص کم عقل ہو یا ضعیف ہو یا دستاویز وغیرہ لکھنے لکھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اُس کے ولی یا وکیل کو سچائی اور انصاف کے ساتھ یہ دستاویز لکھانی چاہیے۔

اِس پر دو مسلمان مردوں کی گواہی ثبت کی جائے جو میل جول اور تعلق کے لوگوں میں سے اور پسندیدہ اخلاق وعمل کے، ثقہ، معتبر اور ایمان دار ہوں۔

اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اِس لیے ہے کہ گھر میں رہنے والی یہ بی بی اگر عدالت کے ماحول میں گھبراہٹ میں مبتلا ہو تو گواہی کو ابہام واضطراب سے بچانے کے لیے ایک دوسری بی بی اُس کے لیے سہارا بن جائے۔*

جو لوگ کسی دستاویز کے گواہوں میں شامل ہو چکے ہوں، گواہی کے موقع پر اُنھیں گواہی سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

---

* یہ سد ذریعہ کا حکم ہے۔ چنانچہ عورتوں کے حالات میں تبدیلی کے باعث اِس کی ضرورت باقی نہ رہے تو اِس پر عمل کرنا بھی ضروری نہیں ہوگا۔

دست گرداں لین دین کے لیے تحریر و کتابت کی پابندی نہیں ہے۔ ہاں، اگر کوئی اہمیت رکھنے والی خرید و فروخت ہوئی ہے تو اُس پر گواہ بنا لینا چاہیے تاکہ کوئی نزاع پیدا ہو تو اُس کا تصفیہ ہو سکے۔

نزاع پیدا ہو جانے کی صورت میں کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی فریق کے لیے جائز نہیں ہے۔

آدمی سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ملے تو قرض کا معاملہ رہن قبضہ کرانے کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ رہن کی اجازت اُسی وقت تک ہے، جب تک قرض دینے والے کے لیے اطمینان کی صورت پیدا نہیں ہو جاتی۔ یہ صورت پیدا ہو جائے تو قرض پر گواہی کرا کے رہن رکھی ہوئی چیز لازماً واپس کر دینی چاہیے۔

کسی شخص کی موت آجائے اور اپنے مال سے متعلق اُس کو کوئی وصیت کرنی ہو تو اپنے مسلمان بھائیوں میں سے دو ثقہ آدمیوں کو اُسے بھی اپنی اِس وصیت پر گواہ بنا لینا چاہیے۔

موت کا یہ مرحلہ اگر کسی شخص کو سفر میں پیش آئے اور گواہ بنانے کے لیے وہاں دو مسلمان میسر نہ ہوں تو مجبوری کی حالت میں وہ دو غیر مسلموں کو بھی گواہ بنا سکتا ہے۔

مسلمانوں میں سے جن دو آدمیوں کو گواہی کے لیے منتخب کیا جائے، اُن کے بارے میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ کسی شخص کی جانب داری میں وہ اپنی گواہی میں کوئی ردوبدل کر دیں گے تو اِس کے سد باب کی غرض سے یہ تدبیر کی جا سکتی ہے کہ کسی نماز کے بعد اُنھیں مسجد میں روک لیا جائے اور اُن سے اللہ کے نام پر قسم لی جائے کہ اپنے

کسی دنیوی فائدے کے لیے یا کسی کی جانب داری میں، خواہ وہ اُن کا کوئی قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنی گواہی میں کوئی تبدیلی نہ کریں گے اور اگر کریں گے تو گناہ گار ٹھیریں گے۔

گواہوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ گواہی خدا کی گواہی ہے، لہٰذا اِس میں کوئی ادنیٰ خیانت بھی اگر اُن سے صادر ہوئی تو وہ نہ صرف بندوں کے، بلکہ خدا کے بھی خائن قرار پائیں گے۔

اِس کے باوجود اگر یہ بات علم میں آجائے کہ گواہوں نے وصیت کرنے والے کی وصیت کے خلاف کسی کے ساتھ جانب داری برتی ہے یا کسی کی حق تلفی کی ہے تو جن کی حق تلفی ہوئی ہے، اُن میں سے دو آدمی اٹھ کر قسم کھائیں گے کہ ہم اِن اولی بالشہادت گواہوں سے زیادہ سچے ہیں۔ ہم نے اِس معاملے میں حق سے کوئی تجاوز نہیں کیا اور ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ایسا کیا ہو تو خدا کے حضور میں ظالم قرار پائیں۔

گواہوں پر اِس مزید احتساب کا فائدہ یہ ہے کہ اِس کے خیال سے توقع ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے۔ ورنہ اُنھیں ڈر ہو گا کہ اُنھوں نے اگر کسی بدعنوانی کا ارتکاب کیا تو اُن کی قسمیں دوسروں کی قسموں سے باطل قرار پائیں گی اور اولیٰ بالشہادت ہونے کے باوجود اُن کی گواہی رد ہو جائے گی۔

## ۴۔ تقسیم وراثت

ہر مسلمان کی دولت اُس کے مرنے کے بعد درج ذیل طریقے سے اُس کے وارثوں میں لازماً تقسیم کر دینی چاہیے:

مرنے والے کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے اُس کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا۔ پھر کوئی وصیت اگر اُس نے کی ہو تو وہ پوری کی جائے گی۔ اِس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔

وارث کے حق میں وصیت نہیں ہو سکتی، الّا یہ کہ اُس کے حالات یا اُس کی کوئی خدمت یا ضرورت کسی خاص صورت حال میں اِس کا تقاضا کرے۔

والدین اور بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد ترکے کی وارث میت کی اولاد ہے۔ مرنے والے نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اُس کی اولاد میں دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہی ہوں تو اُنھیں بچے ہوئے ترکے کا دو تہائی دیا جائے گا۔ ایک ہی لڑکی ہو تو وہ اُس کے نصف کی حق دار ہوگی۔ میت کی اولاد میں صرف لڑکے ہی ہوں تو یہ سارا مال اُن میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اولاد میں لڑکے لڑکیاں، دونوں ہوں تو ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا اور اِس صورت میں بھی سارا مال اُنھی میں تقسیم کیا جائے گا۔

اولاد کی غیر موجودگی میں میت کے بھائی بہن اولاد کے قائم مقام ہیں۔ والدین اور بیوی یا شوہر موجود ہوں تو اُن کا حصہ دینے کے بعد میت کے وارث یہی ہوں

گے۔ ذکور وا ناث کے لیے اُن کے حصے اور اُن میں تقسیم وراثت کا طریقہ وہی ہے جو اولاد کے لیے اوپر بیان ہوا ہے۔

میت کے اولاد ہو یا اولاد نہ ہو اور بھائی بہن ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ بھائی بہن بھی نہ ہوں اور تنہا والدین ہی میت کے وارث ہوں تو ترکے کا ایک تہائی ماں اور دو تہائی باپ کا حق ہے۔

مرنے والا مرد ہو اور اُس کی اولاد ہو تو اُس کی بیوی کو ترکے کا آٹھواں حصہ ملے گا۔ اُس کے اولاد نہ ہو تو وہ ایک چوتھائی ترکے کی حق دار ہوگی۔ میت عورت ہو اور اُس کی اولاد نہ ہو تو نصف ترکہ اُس کے شوہر کا ہے، اور اگر اُس کے اولاد ہو تو شوہر کو چوتھائی ترکہ ملے گا۔

اِن وارثوں کی عدم موجودگی میں مرنے والا اگر چاہے تو کسی کو ترکے کا وارث بنا سکتا ہے۔ جس شخص کو وارث بنایا گیا ہو، وہ اگر رشتہ دار ہو اور اُس کا ایک بھائی یا بہن ہو تو چھٹا حصہ اور ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں تو ایک تہائی اُنھیں دینے کے بعد باقی ۵/۶ یا دو تہائی اُسے ملے گا۔

یہ تقسیم جس بنیاد پر قائم ہے، وہ قرابت نافعہ ہے اور حصوں میں فرق کی وجہ بھی اُن کے پانے والوں کی طرف سے مرنے والے کے لیے اُن کی منفعت کا کم یا زیادہ ہونا ہی ہے۔ لڑکیوں کی منفعت چونکہ شادی کے بعد اُن کے شوہر کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اِسی طرح بیوی شوہر کو رفاقت مہیا کرتی ہے، لیکن شوہر رفاقت کے ساتھ اُس کے

نان ونفقہ کی ذمہ داری بھی اٹھاتا ہے، اِس لیے لڑکوں کا حصہ لڑکیوں سے اور شوہر کا حصہ بیوی سے دوگنا رکھا گیا ہے۔

۵

# قانون دعوت

دین کا ایک اہم مطالبہ یہ ہے کہ جو لوگ اِس دنیا میں حق کو اختیار کریں، وہ اُسے اختیار کر لینے کے بعد دوسروں کو بھی برابر اُس کی تلقین و نصیحت کرتے رہیں۔ دین کا یہی مطالبہ ہے جس کے لیے بالعموم دعوت و تبلیغ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اِس کا جو قانون قرآن میں بیان ہوا ہے، اُس میں دعوت کی ذمہ داری اہل ایمان کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے بالکل الگ الگ صورتوں میں اُن پر عائد کی گئی ہے۔ اِسے ہم درج ذیل عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں:

## پیغمبر کی دعوت

اللہ تعالیٰ کے جو پیغمبر بھی دنیا میں آئے ہیں، دعوت الی اللہ اور انذار و بشارت کے لیے آئے ہیں۔ اِن میں سے نبیوں کا انذار و بشارت تو کسی وضاحت کا تقاضا نہیں کرتا، لیکن نبیوں میں سے اللہ تعالیٰ جنھیں رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے، اُن کے بارے میں البتہ، قرآن نے بتایا ہے کہ وہ اِس انذار کو اپنی قوموں پر شہادت کے مقام

تک پہنچا دینے کے لیے مامور تھے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ حق لوگوں پر اِس طرح واضح کر دیا جائے کہ اِس کے بعد کسی شخص کے لیے اُس سے انحراف کی گنجایش نہ ہو۔ اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ اُن کے ذریعے سے اِسی دنیا میں برپا کر دیتے ہیں۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے میثاق پر قائم رہیں گے تو اِس کی جزا اور اِس سے انحراف کریں گے تو اِس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا اُن کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اِس کے ساتھ اُنھیں حکم دیا جاتا ہے کہ جس حق کو وہ بچشم سر دیکھ چکے ہیں، اُس کی تبلیغ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیں۔ یہی شہادت ہے۔ رسولوں کی دعوت میں انذار، انذار عام، اتمام حجت اور ہجرت و براءت کے مراحل سے گزر کر یہ شہادت جب قائم ہو جاتی ہے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو غلبہ عطا فرماتے اور اِن کی دعوت کے منکرین پر اِسی دنیا میں اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔

## ذریت ابراہیم کی دعوت

یہ دعوت وہی شہادت ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ

ذریت ابراہیم کو بھی اللہ تعالیٰ نے اِس شہادت کے لیے اُسی طرح منتخب کیا اور اِس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کا حکم دیا ہے، جس طرح وہ بنی آدم میں سے بعض جلیل القدر ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔

ذریت ابراہیم کا یہی منصب ہے جس کے تحت یہ اگر حق پر قائم ہو اور اُسے بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتی رہے تو اُن کے نہ ماننے کی صورت میں اللہ تعالیٰ اِن قوموں پر اِسے غلبہ عطا فرماتے اور اِس سے انحراف کرے تو اِنھی کے ذریعے سے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

## علما کی دعوت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انذار کی ذمہ داری اِس امت کے علما کو منتقل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی ہر جماعت میں سے کچھ لوگ نکل کر آئیں، دین کا علم حاصل کریں اور اپنی قوم کے لیے نذیر بن کر اُسے آخرت کے عذاب سے بچانے کی کوشش کریں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کی اِس صورت میں یہ چند باتیں لازماً ملحوظ رہنی چاہییں:

اول یہ کہ اِس کے لیے اٹھنے والے جس حق کو لے کر اٹھیں، اُس پر اُن کا اپنا ایمان بالکل راسخ ہونا چاہیے۔ وہ جو بات بھی لوگوں کے سامنے پیش کریں، اُس پر اُن کے دل و دماغ کو اِس طرح مطمئن ہونا چاہیے کہ وہ خود بھی محسوس کریں کہ یہ اُن کے دل کی

آواز اور روح کی صدا ہے جو اُن کی زبان پر آئی ہے۔ وہ اپنی ساری شخصیت کو اپنے رب کے حوالے کر کے اِس میدان میں اتریں اور جس چیز کی طرف لوگوں کو بلائیں، اُس کے بارے میں سب سے پہلے خود یہ اعلان کریں کہ وہ پورے دل اور پوری جان سے اُس پر ایمان لائے ہیں۔

دوم یہ کہ اُن کے قول و عمل میں کسی پہلو سے کوئی تضاد نہ ہو۔ وہ جس چیز کے علم بردار بن کر اٹھیں، سب سے پہلے خود اُسے اپنائیں اور جس حق کی لوگوں کو دعوت دیں، اُن کا عمل بھی اُسی کی شہادت دے۔

سوم یہ کہ وہ حق کے معاملے میں کسی مداہنت سے کام نہ لیں۔ دین کی چھوٹی سی چھوٹی حقیقت بھی جو اُن پر واضح ہو جائے، اُسے دل سے قبول کریں، زبان سے اُس کی گواہی دیں اور ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا کیے بغیر اُسے بے کم و کاست دنیا کے سامنے پیش کر دیں۔

چہارم یہ کہ اپنے انذار کا ذریعہ وہ قرآن مجید کو بنائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن نے اِسی کا حکم دیا ہے اور آپ اِسی بنا پر پوری دنیا کے لیے نذیر ہیں۔ علما درحقیقت آپ ہی کے اِس انذار کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

## ریاست کی دعوت

مسلمانوں کو اگر کسی خطۂ ارض میں سیاسی خود مختاری حاصل ہو جائے تو اُن کی ذمہ داری ہے کہ اپنے اندر سے کچھ لوگوں کو اِس کام پر مقرر کریں کہ وہ لوگوں کو خیر کی طرف بلائیں،

برائی سے روکیں اور بھلائی کی تلقین کریں۔ قیام حکومت کے بعد یہ فرض مسلمانوں کے ارباب حل وعقد پر عائد ہوتا ہے۔ اُن پر لازم ہے کہ نظم ریاست سے متعلق دوسری تمام فطری ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے ساتھ وہ اپنی یہ ذمہ داری بھی لازماً پوری کریں۔

## فرد کی دعوت

فرد کی دعوت اپنے ماحول اور اپنے دائرۂ عمل میں ایک دوسرے کو بھلائی کی نصیحت کرنا اور برائی سے روکنا ہے۔ دعوت کی اِس صورت میں داعی اور مدعو الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ ہر شخص جس طرح ہر وقت داعی ہے، اِسی طرح مدعو بھی ہے۔ یہ فرض باپ کو بیٹے کے لیے اور بیٹے کو باپ کے لیے، بیوی کو شوہر کے لیے اور شوہر کو بیوی کے لیے، بھائی کو بہن کے لیے اور بہن کو بھائی کے لیے، دوست کو دوست کے لیے اور پڑوسی کو پڑوسی کے لیے، غرض یہ کہ ہر شخص کو اپنے ساتھ متعلق ہر شخص کے لیے ادا کرنا چاہیے۔ وہ جہاں یہ دیکھے کہ اُس کے متعلقین میں سے کسی نے کوئی خلاف حق طریقہ اختیار کیا ہے، اُسے چاہیے کہ اپنے علم اور اپنی استعداد وصلاحیت کے مطابق اُسے راستی کی روش اپنانے کی نصیحت کرے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ صبح ہم کسی شخص کو بھلائی کی ترغیب دیں اور شام کے وقت وہ ہمارے لیے یہ خدمت انجام دے۔ آج ہم کسی کو کوئی حق پہنچائیں اور کل وہ ہمیں اِس کی تلقین کرے۔ غرض یہ کہ جب موقع میسر آئے، ہر مسلمان کو اپنے دائرۂ عمل میں یہ کام لازماً انجام دیتے رہنا چاہیے۔

# دعوت کی حکمت عملی

دعوت کی یہ حکمت عملی اِس کی ہر صورت سے متعلق ہے۔ قرآن نے اِسے ایک اصل اصول کی حیثیت سے بیان کیا ہے اور یہ درج ذیل تین نکات پر مبنی ہے:

اول یہ کہ دعوت ہمیشہ حکمت و موعظت اور مجادلۂ احسن کے اسلوب میں پیش کرنی چاہیے۔ حکمت سے مراد دلائل و براہین ہیں اور موعظت حسنہ سے دردمندانہ تذکیرو نصیحت۔ مدعا یہ ہے کہ داعی جو بات بھی کہے، وہ دلیل و برہان اور علم و عقل کی روشنی میں کہے اور اُس کا انداز چڑھ دوڑنے اور دھونس جمانے کا نہیں، بلکہ خیر خواہی اور شفقت و محبت کے ساتھ توجہ دلانے کا ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ بحث و مباحثہ کی نوبت بھی اگر آجائے تو اُس کے لیے پسندیدہ طریقے اختیار کیے جائیں اور اِس کے جواب میں حریف اشتعال انگیزی پر اتر آئے تو اُس کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے بجائے داعی حق ہمیشہ مہذب اور شایستہ ہی رہے۔

دوم یہ کہ داعی کی ذمہ داری صرف دعوت تک محدود ہے، یعنی بات پہنچا دی جائے، حق کو ہر پہلو سے واضح کر دیا جائے اور ترغیب و تلقین میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔ اُس نے اگر اپنا یہ فرض صحیح طریقے سے ادا کر دیا تو وہ اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہوا۔ لوگوں کی ہدایت اور گمراہی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ وہ اُن کو بھی جانتا ہے جو اُس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اُن کو بھی جو

ہدایت پانے والے ہیں۔ لہٰذا ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ داعی کو نہ داروغہ بننا چاہیے، نہ اپنے مخاطبین کے لیے جنت اور جہنم کے فیصلے صادر کرنے چاہییں۔ یہ سب معاملات اللہ تعالیٰ سے متعلق ہیں۔ داعی حق کی ذمہ داری صرف ابلاغ ہے۔ اُسے چاہیے کہ اپنی اِس ذمہ داری سے ہرگز کوئی تجاوز نہ کرے۔

سوم یہ کہ دعوت کے مخاطبین اگر ظلم و زیادتی اور ایذا رسانی پر اتر آئیں تو داعی کو اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے اتنا بدلہ لینے کا حق ہے جتنی تکلیف اُسے پہنچائی گئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ صبر سے کام لیا جائے۔ اِس صبر کے معنی یہ ہیں کہ حق کے داعی ہر اذیت برداشت کرلیں، لیکن نہ انتقام کے لیے کوئی اقدام کریں، نہ مصیبتوں اور تکلیفوں سے گھبرا کر اپنے موقف میں کوئی ترمیم و تغیر کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اِس موقع پر صبر کرنے والوں کے لیے بڑی نعمت کا وعدہ ہے۔ اِس کا نتیجہ دنیا میں بھی اُن کے لیے بہترین صورت میں ظاہر ہوگا اور قیامت میں بھی خدا نے چاہا تو وہ اِس کے بہترین نتائج دیکھیں گے۔

٦

# قانون جہاد

امن اور آزادی انسانی تمدن کی ناگزیر ضرورت ہے۔ فرد کی سرکشی سے اُس کی حفاظت کے لیے تادیب اور سزائیں ہیں، لیکن اگر قومیں شوریدہ سر ہو جائیں تو ہر شخص جانتا ہے کہ اُن کے خلاف تلوار اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ نصیحت اور تلقین جب تک کارگر ہو، تلوار اٹھانے کو کوئی شخص بھی جائز قرار نہ دے گا، مگر جب کسی قوم کی سرکشی اور شوریدہ سری اِس حد کو پہنچ جائے کہ اُسے نصیحت اور تلقین سے صحیح راستے پر لانا ممکن نہ رہے تو انسان کا حق ہے کہ اُس کے خلاف تلوار اٹھائے اور اُس وقت تک اٹھائے رکھے، جب تک امن اور آزادی کی فضا دنیا میں بحال نہ ہو جائے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تلوار اٹھانے کی یہ اجازت اگر نہ دی جاتی تو قوموں کی سرکشی اِس انتہا کو پہنچ جاتی کہ تمدن کی بربادی کا تو کیا ذکر، معبد تک ویران کر دیے جاتے اور اُن جگہوں پر خاک اڑتی، جہاں اب شب و روز اللہ پروردگار عالم کا نام لیا جاتا اور اُس کی عبادت کی جاتی ہے۔

اسلامی شریعت میں جہاد* اِسی مصلحت سے کیا جاتا ہے۔ یہ نہ خواہش نفس کے لیے ہے، نہ مال و دولت کے لیے، نہ ملک کی تسخیر اور زمین کی حکومت کے لیے، نہ شہرت و ناموری کے لیے اور نہ حمیت و حمایت اور عصبیت یا عداوت کے کسی جذبے کی تسکین کے لیے۔ انسان کی خود غرضی اور نفسانیت کا اِس جہاد و قتال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اللہ کی جنگ ہے جو اُس کے بندے، اُس کے حکم پر اور اُس کی ہدایت کے مطابق اُس کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اُن کی حیثیت اِس جنگ میں محض آلات و جوارح کی ہے۔ اِس میں اُنھیں اپنا کوئی مقصد نہیں، بلکہ خدا کے مقاصد پورے کرنا ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی اِس حیثیت سے سر موکوئی انحراف نہیں کر سکتے۔

اِس کا قانون یہ ہے:

## ۱۔ جہاد کا حکم

جہاد و قتال کا حکم مسلمانوں کو بحیثیت جماعت دیا گیا ہے۔ اِس کی جو آیتیں بھی قرآن میں آئی ہیں، مسلمان اپنی انفرادی حیثیت میں اُن کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ حدود و تعزیرات کی طرح اِن آیات کے مخاطب وہ بحیثیت جماعت ہیں۔ لہٰذا اِس معاملے میں کسی اقدام کا حق بھی اُن کے نظم اجتماعی کو حاصل ہے۔ اُن کے اندر کا کوئی فرد

---

* جہاد کے معنی کسی جدوجہد میں پوری قوت صرف کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ تعبیر جس طرح اللہ کی راہ میں عام جدوجہد کے لیے استعمال ہوئی ہے، اِسی طرح قتال فی سبیل اللہ کے لیے بھی آئی ہے۔ یہاں اِس کا یہی دوسرا مفہوم پیش نظر ہے۔

یا گروہ ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اُن کی طرف سے اِس طرح کے کسی اقدام کا فیصلہ کرے۔

## ۲۔ جہاد کا مقصد

قرآن میں اس کا حکم اصلاً فتنہ کے استیصال کے لیے آیا ہے۔ اِس کے معنی کسی شخص کو ظلم و جبر کے ساتھ اُس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں 'persecution' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جان و مال اور عقل و رائے کے خلاف زیادتی کی دوسری تمام صورتیں اِسی کے تحت ہیں۔ چنانچہ ظلم و عدوان جس صورت میں بھی ہو، یہ اُس کے خلاف کیا جا سکتا ہے۔

## ۳۔ جہاد کی فرضیت

جہاد مسلمانوں پر اُس وقت تک فرض نہیں ہوتا، جب تک دشمن کے مقابلے میں اُن کی حربی قوت ایک خاص حد تک نہ پہنچ جائے، لہٰذا ضروری ہے کہ جہاد و قتال کی اِس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے وہ نہ صرف یہ کہ اپنے اخلاقی وجود کو محکم رکھنے کی کوشش کریں، بلکہ اپنی حربی قوت بھی اُس درجے تک لازماً بڑھائیں جس کا حکم قرآن نے زمانۂ رسالت کے مسلمانوں کو اُس وقت کی صورت حال کے لحاظ سے دیا تھا اور اُن کے اور اُن کے دشمنوں کے درمیان اِس کے لیے ایک اور دو کی نسبت قائم کر دی تھی۔

## ۴۔ جہاد میں شرکت

جہاد میں عملاً حصہ نہ لینا صرف اُس صورت میں جرم ہے، جب کوئی مسلمان نفیر عام کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے۔ اُس وقت یہ بے شک، نفاق جیسا بڑا جرم بن جاتا

ہے۔ یہ صورت نہ ہو تو جہاد ایک فضیلت ہے، جس کے حصول کا جذبہ ہر شخص میں ہونا چاہیے۔ لیکن اس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت ہی کی ہے، یہ اُن فرائض میں سے نہیں ہے جنھیں پورا نہ کیا جائے تو آدمی مجرم قرار پائے۔

## ۵۔ جہاد سے فرار

جہاد و قتال کے لیے میدان میں اترنے کے بعد بزدلی اور فرار کی نوعیت کا پیٹھ دکھانا حرام ہے۔ کسی صاحب ایمان کو ہرگز اِس کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بے اعتمادی، دنیا کی آخرت پر ترجیح اور موت و حیات کو اپنی تدبیر پر منحصر قرار دینے کا جرم ہے، جس کی ایمان کے ساتھ کوئی گنجایش نہیں مانی جا سکتی۔

## ۶۔ اخلاقی حدود

جہاد اخلاقی حدود سے بے پروا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے اِن سے انحراف کی اجازت کسی شخص کو نہیں دی۔ اِس حکم کے ذیل میں جو سب سے اہم ہدایت قرآن میں بیان ہوئی ہے، وہ عہد کی پابندی کی ہے۔ غدر اور نقض عہد کو اللہ تعالیٰ نے بدترین گناہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ کوئی معاہد قوم اگر مسلمانوں پر ظلم بھی کر رہی ہو تو معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اُن کی مدد نہیں کی جا سکتی۔ اِسی طرح جو لوگ جنگ کے موقع پر کسی وجہ سے غیر جانب دار رہنا چاہتے ہوں، اُن کے خلاف بھی کسی اقدام کی اجازت نہیں ہے۔

جہاد کے لیے نکلتے وقت تکبر اور نمایش کا رویہ بھی اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ طنطنہ اور

طمطراق کسی بندۂ مومن کے شایان شان نہیں ہے۔ رزم ہو یا بزم، خدا کے بندوں پر عبدیت کی تواضع اور فروتنی ہر حال میں نمایاں رہنی چاہیے۔

## ۷۔ نصرت الٰہی

مسلمان یہ جنگ اللہ کے بھروسے پر لڑتے ہیں، لیکن قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اِس میں اللہ کی مدد حاصل کرنے کے لیے سب سے بنیادی چیز صبر و ثبات ہے۔ مسلمانوں کی کسی جماعت کے لیے نصرت الٰہی کا استحقاق اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتا، جب تک وہ یہ صفت اپنے اندر پیدا نہ کر لے۔

## ۸۔ اسیران جنگ

جنگ کے قیدیوں کو مسلمان چھوڑ بھی سکتے ہیں اور اُن سے فدیہ بھی لے سکتے ہیں، مگر اُنھیں قتل کرنے یا لونڈی غلام بنا کر رکھ لینے کی گنجایش قرآن مجید نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دی ہے۔

## ۹۔ اموال غنیمت

اموال غنیمت اصلاً اجتماعی مقاصد کے لیے خاص ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجاہدین کا کوئی ابدی حق اُن میں قائم نہیں کیا گیا کہ مسلمانوں کی حکومت اُسے ہر حال میں ادا کرنے کی پابند ہو۔ وہ اپنے حالات اور اپنی تمدنی ضرورتوں کے لحاظ سے جو طریقہ چاہے، اِس معاملے میں اختیار کر سکتی ہے۔

---

۷

# حدود و تعزیرات

ارادہ و اختیار کی نعمت جہاں اِس دنیا میں انسان کے لیے سب سے بڑا شرف ہے، وہاں اِس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ اِس کے سوءِ استعمال سے بارہا زمین پر فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ انسانی تاریخ میں اِس فساد کا سب سے پہلا ظہور ابوالبشر آدم کے بیٹے قابیل کے ہاتھ سے ہوا، لہٰذا یہ ضرورت اِس کے ساتھ ہی سامنے آ گئی کہ انسان کو خود انسان کے اِس شر و فساد سے بچانے کے لیے کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ جرم و سزا کے تمام ضابطے اِسی ضرورت سے وضع کیے گئے ہیں۔ اِن میں اصلی مقصود شر و فساد کا استیصال ہی ہوتا ہے اور وہی ہونا چاہیے، لیکن جو لوگ خدا کی ہدایت کو قبول کر کے اُس کے رسولوں پر ایمان لے آئیں، اُن کا معاملہ عام مجرموں کا نہیں ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اگر جان، مال، آبرو یا نظم اجتماعی کے خلاف کسی بڑے جرم کا ارتکاب کریں تو خدا کا فیصلہ ہے کہ اُن کو اِسی دنیا میں عذاب دیا جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور وہ خدا کی اِس عقوبت کو دیکھ کر آخرت کے عذاب کی یاد دہانی حاصل کریں۔ پھر

مزید یہ کہ مجرموں کے لیے بھی یہ عذاب، اگر وہ توبہ اور اصلاح کا رویہ اختیار کریں تو گناہ سے تطہیر کا ذریعہ بن جائے۔

یہ عذاب جن سزاؤں کی صورت میں دیا جاتا ہے، وہ ہمیشہ سخت رہی ہیں۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ اِن سزاؤں کا مقصد محض جرم کا استیصال نہیں، بلکہ اُن سب لوگوں کو خدا کے عذاب کا مزہ چکھانا اور دوسروں کے لیے عبرت بنا دینا بھی ہے، جنھوں نے پورے شعور کے ساتھ اپنے آپ کو خدا اور اُس کے رسولوں کے حوالے کیا، اُن سے عہد اطاعت باندھا، اُن کے دین کو دین کی حیثیت سے قبول کیا اور اِس کے بعد اِس نوعیت کے بڑے جرائم میں اِس حد تک ملوث ہو گئے کہ خدا نے اُن کا پردہ فاش کر دیا اور معاملات عدالت تک پہنچ گئے۔ یہ جرائم درج ذیل ہیں:

۱۔ محاربہ اور فساد فی الارض

۲۔ قتل و جراحت

۳۔ زنا

۴۔ قذف

۵۔ چوری

شریعت میں جن جرائم کی سزائیں مقرر کی گئی ہیں، وہ یہی ہیں۔ اِن کی ادنیٰ صورتوں اور اِن کے علاوہ باقی سب جرائم کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ارباب حل و عقد پر چھوڑ دیا ہے۔ باہمی مشورے سے وہ اِس معاملے میں جو قانون

چاہیں، بنا سکتے ہیں۔ تاہم اتنی بات اُس میں بھی طے ہے کہ موت کی سزا قرآن کی رو سے قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں نہیں دی جا سکتی۔ اِسی طرح یہ بات بھی طے ہے کہ اِن جرائم کی سزا کا حکم مسلمانوں کو اُن کی انفرادی حیثیت میں نہیں، بلکہ پورے مسلمان معاشرے کو دیا گیا ہے اور اس لحاظ سے اُن کے نظم اجتماعی سے متعلق ہے۔

ہم یہاں اِن سزاؤں کی وضاحت کریں گے:

## محاربہ اور فساد فی الارض

اللہ کا رسول دنیا میں موجود ہو اور لوگ اُس کی حکومت میں اُس کے کسی حکم یا فیصلے کے خلاف سرکشی اختیار کر لیں تو یہ اللہ و رسول سے محاربہ ہے۔ اِسی طرح فساد فی الارض کی تعبیر ہے۔ یہ اُس صورت حال کے لیے آتی ہے، جب کوئی شخص یا گروہ قانون سے بغاوت کر کے لوگوں کی جان و مال، آبرو اور عقل و رائے کے خلاف برسر جنگ ہو جائے۔ چنانچہ قتل، دہشت گردی، زنا، زنا بالجبر اور چوری ڈاکا بن جائے یا لوگ بدکاری کو پیشہ بنا لیں یا کھلم کھلا اوباشی پر اتر آئیں یا اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت و آبرو کے لیے خطرہ بن جائیں یا نظم ریاست کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں یا اغوا، تخریب، ترہیب اور اِس طرح کے دوسرے سنگین جرائم سے حکومت کے لیے امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیں تو وہ فساد فی الارض کے مجرم ہوں گے۔ اُن کی سرکوبی کے لیے یہ چار سزائیں مقرر کی گئی ہیں:

۱۔ عبرت ناک طریقے سے قتل کر دیا جائے۔

۲۔عبرت ناک طریقے سے سولی دی جائے۔

۳۔ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دیے جائیں۔

۴۔علاقہ بدر کر دیا جائے۔

اِن سزاؤں سے متعلق چند باتیں حدود وشرائط کے طور پر بیان ہوئی ہیں:

ایک یہ کہ قرآن نے حکومت کو اختیار دیا ہے کہ وہ جرم کی نوعیت، مجرم کے حالات اور جرم کے موجود اور متوقع اثرات کے لحاظ سے اِن میں سے جو سزا مناسب سمجھے، اِس طرح کے مجرموں کو دے سکتی ہے۔ عبرت ناک طریقے سے قتل کرنے اور سولی دینے جیسی سزاؤں کے ساتھ اِس میں علاقہ بدری کی سزا اِس لیے رکھی گئی ہے کہ سزا میں انتہائی سختی کے ساتھ حالات کا تقاضا ہو تو مجرم کے ساتھ نرمی کے لیے بھی گنجایش باقی رکھی جائے۔

دوسرے یہ کہ جرم اگر جتھا بنا کر ہوا ہے تو اُس کی سزا بھی انفرادی حیثیت سے نہیں، بلکہ اُس جتھے کو جتھے ہی کی حیثیت سے دی جائے گی۔ چنانچہ مجرموں کا کوئی گروہ اگر فساد فی الارض کے طریقے پر قتل، اغوا، زنا، تخریب، ترہیب اور اِس طرح کے دوسرے جرائم کا مرتکب ہوا ہے تو اِس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ متعین طور پر جرم کا ارتکاب کن ہاتھوں سے ہوا اور کن سے نہیں ہوا ہے، بلکہ جتھے کا ہر فرد اِس ذمہ داری میں شریک سمجھا جائے گا اور اُس کے ساتھ معاملہ بھی لازماً اِسی حیثیت سے ہوگا۔

تیسرے یہ کہ اِس طرح کے مجرموں کو سزا دیتے وقت کسی شخص کے دل میں ہم دردی کے کوئی جذبات پیدا نہیں ہونے چاہییں۔ وہ پروردگار جو اُن کا خالق ہے، اِن جرائم

کے بعد اُس کا فیصلہ یہی ہے کہ اُنھیں اِس دنیا میں بالکل رسوا کر دیا جائے۔ اِن سزاؤں کا مقصد یہی ہے اور اِسے ہر حال میں پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

چوتھے یہ کہ اِس طرح کے مجرم اگر حکومت کے کسی اقدام سے پہلے خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیں تو اُن سے پھر عام مجرموں ہی کا معاملہ کیا جائے گا۔ اِس صورت میں اُنھیں محاربہ یا فساد فی الارض کا مجرم قرار نہیں دیا جائے گا۔

## قتل و جراحت

اِس کا قصاص ایک فرض ہے جو مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کیا گیا ہے۔ معاشرے کے لیے اِسی میں زندگی ہے اور مسلمانوں کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ قانون ہے جس سے انحراف صرف ظالم ہی کرتے ہیں، لہٰذا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اُس کے علاقے میں اگر کوئی شخص قتل کر دیا جائے تو اُس کے قاتلوں کا سراغ لگائے، اُنھیں گرفتار کرے اور قانون کے مطابق اُن سے قصاص لے۔

قصاص کے معاملے میں پوری مساوات ملحوظ رہنی چاہیے، لہٰذا اگر کوئی غلام قاتل ہے تو اُس کے بدلے میں وہی غلام اور آزاد قاتل ہے تو اُس کے بدلے میں وہی آزاد قتل کیا جائے۔ کسی شخص کا معاشرتی اور سماجی مرتبہ اِس معاملے میں ہرگز کسی ترجیح کا باعث نہیں بننا چاہیے۔

خود مجروح یا مقتول کے اولیا اگر جان کے بدلے میں جان، عضو کے بدلے میں عضو اور زخم کے بدلے میں زخم کا مطالبہ نہ کریں اور مجرم کے ساتھ نرمی برتنے کے

لیے تیار ہو جائیں تو عدالت جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات کے پیش نظر اُسے کوئی کم تر سزا بھی دے سکتی ہے*۔ یہ خدا کی طرف سے لوگوں کے لیے ایک رعایت اور اُن پر اُس کی عنایت ہے۔ چنانچہ اِس جرم کے متاثرین اگر اِسے اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں اُن کی یہ معافی اُن کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔

مجروح یا مقتول کے اولیا کو اِس صورت میں مجرم کی طرف سے دیت دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ معاشرے کے دستور کے مطابق اور نہایت حسن و خوبی سے ادا کی جائے۔

قتل اگر غلطی سے ہوا ہے اور مقتول اپنی ہی ریاست کا کوئی مسلمان شہری ہے یا اپنی ریاست کا شہری تو نہیں ہے، مگر کسی معاہد قوم سے تعلق رکھتا ہے تو قاتل پر لازم ہے کہ اُسے اگر معاف نہیں کر دیا گیا تو معاشرے کے دستور کے مطابق دیت ادا کرے اور اِس جرم کے کفارے میں اور اپنے پروردگار کے حضور میں توبہ کے لیے، اُس کے ساتھ ایک مسلمان غلام بھی آزاد کرے۔ لیکن مقتول اگر دشمن قوم کا کوئی مسلمان ہے تو قاتل پر دیت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اِس صورت میں یہی کافی ہے کہ اپنے اِس گناہ کو دھونے کے لیے وہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے۔ اِن دونوں صورتوں میں اگر غلام میسر نہ ہو تو اُس کے بدلے میں اُسے مسلسل دو مہینے کے روزے رکھنا ہوں گے۔

## زنا

زانی مرد ہو یا عورت، اُس کا جرم اگر ثابت ہو جائے تو اِس کی پاداش میں اُسے

---

* یعنی دے سکتی ہے، دینا لازم نہیں ہے۔

سو کوڑے مارے جائیں گے۔

مجرم کو یہ سزا مسلمانوں کی ایک جماعت کی موجودگی میں دی جائے گی تا کہ اُس کے لیے یہ فضیحت اور دوسروں کے لیے باعث نصیحت ہو۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اہل ایمان کی کسی حکومت یا عدالت کو اِس معاملے میں ہرگز کوئی نرمی روا نہیں رکھنی چاہیے۔

اِس سزا کے بعد کسی پاک دامن مرد یا عورت کو اِس زانی یا زانیہ کے ساتھ نکاح نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے اِسے حرام ٹھیرایا ہے۔

یہ اِس جرم کی انتہائی سزا ہے اور صرف اُنھی مجرموں کو دی جائے گی جن سے جرم بالکل آخری صورت میں سرزد ہو جائے اور اپنے حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کے مستحق نہ ہوں۔ چنانچہ سزا کے تحمل سے معذور، مجبور اور جرم سے بچنے کے لیے ضروری ماحول، حالات اور حفاظت سے محروم سب لوگ اِس سے یقیناً مستثنیٰ ہیں۔

## قذف

اِس کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ کوئی شخص کسی شریف اور پاک دامن عورت یا مرد پر زنا کی تہمت لگائے۔

دوسری یہ کہ اِس طرح کا معاملہ کسی میاں اور بیوی کے درمیان پیش آ جائے۔

پہلی صورت میں اُس شخص کو ہر حال میں چار عینی گواہ پیش کرنا ہوں گے۔ وہ اِس سے قاصر رہے تو اُسے قذف کا مجرم قرار دیا جائے گا جس کی سزا یہ ہے کہ اُسے اسی کوڑے مارے جائیں گے اور اُس کی گواہی پھر کسی معاملے میں بھی قبول نہیں کی

جائے گی۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اِس جرم کے مرتکبین اللہ تعالیٰ کے حضور میں فاسق قرار پائیں گے، الّا یہ کہ اپنے جرم سے توبہ کریں اور آیندہ کے لیے اپنی اصلاح کرلیں۔

دوسری صورت میں شہادت نہ ہو تو معاملے کا فیصلہ قسم سے ہوگا۔ اِس کی صورت یہ ہوگی کہ میاں چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے گا کہ وہ جو الزام لگا رہا ہے، اُس میں سچا ہے اور پانچویں مرتبہ یہ کہے گا کہ وہ اگر اِس الزام میں جھوٹا ہے تو اُس پر خدا کی لعنت ہو۔ اِس کے جواب میں عورت اگر اِس قسم کی کوئی مدافعت نہ کرے تو اُس پر زنا کی وہی سزا جاری ہو جائے گی جو شریعت میں اُس کے لیے مقرر ہے۔ لیکن وہ اگر اِس الزام کو تسلیم نہیں کرتی تو صرف اُس صورت میں سزا سے بری قرار پائے گی جب چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو، اگر یہ شخص سچ کہہ رہا ہے۔

یہی معاملہ اُس وقت ہوگا جب بیوی نے میاں پر الزام لگایا ہو۔

## چوری

اِس کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ چور مرد ہو یا عورت، اُس کا جرم اگر ثابت ہو جائے تو اِس کی پاداش میں اُس کا دایاں ہاتھ پونچے سے کاٹ دیا جائے گا۔ زنا کی طرح یہ بھی اِس جرم کی انتہائی سزا ہے اور صرف اُسی صورت میں دی جائے گی جب مجرم اپنے جرم کی نوعیت اور اپنے حالات کے لحاظ سے کسی رعایت کا مستحق نہ رہا ہو۔

# ۸

# خور و نوش

دین ہر پہلو سے نفس انسانی کا تزکیہ چاہتا ہے، اِس لیے اُسے اِس بات پر ہمیشہ اصرار رہا ہے کہ باطن کی تطہیر کے ساتھ کھانے اور پینے کی چیزوں میں بھی خبیث وطیب کا فرق ہر حال میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ انسان کی فطرت اِس معاملے میں بالعموم اُس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کر لیتا ہے کہ کیا چیز طیب اور کیا خبیث ہے۔ وہ ہمیشہ سے جانتا ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گد، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہیں۔ اُسے معلوم ہے کہ گھوڑے اور گدھے دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان جانوروں کے بول و براز کی نجاست سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔ نشہ آور چیزوں کی غلاظت کو سمجھنے میں بھی اُس کی عقل عام طور پر صحیح نتیجے پر پہنچتی ہے۔ چنانچہ خدا کی شریعت نے اِس معاملے میں انسان کو اصلاً اُس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے۔

انسان کی یہ فطرت کبھی کبھی مسخ ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں انسانوں کی عادات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اُن کی ایک بڑی تعداد اِس معاملے میں بالعموم غلطی نہیں کرتی۔ چنانچہ شریعت نے اِس طرح کی کسی چیز کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ اِس باب میں شریعت کا موضوع صرف وہ جانور اور اُن کے متعلقات ہیں جن کی حلت و حرمت کا فیصلہ تنہا عقل و فطرت کی رہنمائی میں کر لینا انسانوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ سؤر انعام کی قسم کے بہائم میں سے ہے، لیکن وہ درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے، پھر اُسے کیا کھانے کا جانور سمجھا جائے گا یا نہ کھانے کا؟ وہ جانور جنھیں ہم ذبح کر کے کھاتے ہیں، اگر تذکیے* کے بغیر مر جائیں تو اُن کا حکم کیا ہونا چاہیے؟ اِنھی جانوروں کا خون کیا اِن کے بول و براز کی طرح نجس ہے یا اُسے حلال و طیب قرار دیا جائے گا؟ یہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کر دیے جائیں تو کیا پھر بھی حلال ہی رہیں گے؟ اِن سوالوں کا کوئی واضح اور قطعی جواب چونکہ انسان کے لیے دینا مشکل تھا اور وہ اِس معاملے میں غلطی کر سکتا تھا، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے اُسے بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے

---

* یہ انبیا علیہم السلام کی قائم کردہ سنت ہے اور بطور اصطلاح جس مفہوم کے لیے بولا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی تیز چیز سے جانور کو زخمی کر کے اُس کا خون اِس طرح بہا دیا جائے کہ اُس کی موت خون بہ جانے ہی کے باعث واقع ہو۔ جانور کو مارنے کی یہی صورت ہے جس میں اُس کا گوشت خون کی نجاست سے پوری طرح پاک ہو جاتا ہے۔

پاک نہیں ہیں اور انسان کو اُن سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اِس حکم کی جو توضیحات قرآن میں بیان ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں:

ا۔ طبعی موت سے مرے ہوئے اور ناگہانی حوادث سے مرے ہوئے جانور میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا، یہ دونوں یکساں مردار ہوں گے۔ کسی درندے کا پھاڑا ہوا جانور بھی مردار ہے، اِلّا یہ کہ اُسے زندہ پا کر ذبح کر لیا گیا ہو۔

۲۔ سدھایا ہوا جانور اگر شکار کو پھاڑ دے اور شکار ذبح کی نوبت آنے سے پہلے ہی دم توڑ دے تو اِس طرح کے جانور کا اُسے پھاڑنا ہی اُس کا تذکیہ ہے، لہٰذا اُسے ذبح کیے بغیر کھایا جا سکتا ہے۔ تاہم اِس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اُسے اپنے مالک کے لیے روک رکھے۔ اُس میں سے جانور نے اگر کچھ کھا لیا ہے تو اُس کا شکار جائز نہ رہے گا۔

۳۔ وہ جانور بھی حرام ہے جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔ جس ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام تو نہیں لیا گیا، لیکن اللہ کا نام بھی نہیں لیا گیا، وہ بھی اِسی کے تحت ہے۔ یہی معاملہ اُس ذبیحہ اور صید کا ہے جس پر اللہ کا نام لیا گیا، مگر نام لینے والا اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتا یا مانتا تو ہے، لیکن خداؤں کی انجمن میں ایک رب الارباب کی حیثیت سے مانتا ہے اور شرک ہی کو اصلاً اپنا دین قرار دیتا ہے۔

۴۔ اِن محرمات سے استثنا صرف حالت اضطرار کا ہے اور وہ بھی اِس طرح کہ آدمی نہ خواہش مند ہو، نہ ضرورت کی حد سے آگے بڑھنے والا ہو۔

۹

# رسوم و آداب

انسان کی تہذیب نفس رہن سہن کے جن طریقوں اور تمدن کے جن مظاہر سے نمایاں ہوتی ہے، اُنھیں ہم اصطلاح میں رسوم و آداب کہتے ہیں۔ انسانی معاشرت کا کوئی دور اِن رسوم و آداب سے خالی نہیں رہا۔ اِنھیں ہم ہر قبیلے، ہر قوم اور ہر تہذیب میں یکساں رائج اور ایک عمومی دستور کی حیثیت سے یکساں جاری دیکھتے ہیں۔ اقوام و ملل کی پہچان ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ تر اِنھی سے قائم ہوتی ہے۔ انبیا علیہم السلام جو دین لے کر آئے ہیں، وہ بھی اپنے ماننے والوں کو بعض رسوم و آداب کا پابند کرتا ہے۔ دین کا مقصد تزکیۂ نفس ہے، لہٰذا دین کے یہ رسوم و آداب بھی اِسی مقصد کو سامنے رکھ کر مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ رسوم و آداب درج ذیل ہیں:

۱۔ اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔

اِن میں سے پہلی چیز اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اعتراف و اقرار اور اُن میں برکت کی دعا کے لیے ہے اور دوسری اِس حقیقت کی ہمہ وقت یاد دہانی کے لیے کہ جنت کی

نعمتیں قیامت کے دن جن لوگوں کو ملیں گی، اُن کا نامۂ اعمال اُن کے دائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا۔

۲۔ ملاقات کے موقع پر 'السلام علیکم' اور اُس کا جواب۔

۳۔ چھینک آنے پر 'الحمد للہ' اور اُس کے جواب میں 'یرحمک اللہ'۔

۴۔ مونچھیں پست رکھنا۔

۵۔ زیرناف کے بال مونڈنا۔

۶۔ بغل کے بال صاف کرنا۔

۷۔ بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔

۸۔ لڑکوں کا ختنہ کرنا۔

۹۔ ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔

۱۰۔ استنجا۔

۱۱۔ حیض ونفاس کے بعد غسل۔

۱۲۔ غسل جنابت۔

۱۳۔ میت کا غسل، تجہیز وتکفین اور تدفین۔

۱۴۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے تہوار۔

---

۱۰

# قسم اور کفارۂ قسم

دین میں قسم کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ عہد پورا کرنا اسلام کے بنیادی اخلاقیات میں سے ہے۔ قسم اِس عہد کو بالکل آخری درجے میں محکم کر دیتی ہے۔ مسلمان جب اپنے کسی عزم، ارادے یا عہد پر اللہ کی قسم کھاتا ہے تو وہ گویا اپنے پروردگار اور عالم کے پادشاہ کو اپنی بات پر گواہ ٹھیراتا ہے۔ قسم کی اِس اہمیت کے باوجود بارہا ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ آدمی کے لیے اپنی قسم پوری کرنا ممکن نہیں رہتا یا وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس سے اللہ کا یا اُس کے نفس کا یا دوسروں کا کوئی حق تلف ہو جائے گا۔ اِس صورت میں قسم توڑی جا سکتی ہے، بلکہ بعض صورتوں میں قسم توڑ دینا دین و اخلاق کی رو سے ضروری ہو جاتا ہے۔ شریعت میں اِس کے لیے کفارے کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ اِس کا حکم درج ذیل ہے:

۱۔ قسم بعض اوقات بالکل لغو، بے فائدہ اور مہمل ہوتی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ بندۂ مومن کو اِس سے بھی اجتناب کرنا چاہیے، لیکن اپنے بندوں پر اللہ تعالیٰ کی یہ

بے پایاں نعمت ہے کہ وہ اِس طرح کی قسموں پر دنیا اور آخرت میں کوئی مواخذہ نہ کرے گا۔

۲۔ اِس کے برعکس اگر قسم پختہ عزم کے ساتھ اور دل کے ارادے سے کھائی گئی ہے، اُس کے ذریعے سے کوئی عہد و پیمان باندھا گیا ہے، اُس سے حقوق و فرائض پر کوئی اثر مترتب ہوتا ہے یا وہ خدا کی کسی تحلیل و تحریم پر اثر انداز ہو سکتی ہے تو اُس پر اللہ تعالیٰ لازماً مواخذہ فرمائے گا۔ لہٰذا قسم کے معاملے میں آدمی کو ہرگز بے پروا اور سہل انگار نہیں ہونا چاہیے، بلکہ پوری ذمہ داری کے ساتھ اُس کی حفاظت کرنی چاہیے۔

۳۔ اِس طرح کی قسم اگر کسی وجہ سے توڑنی پڑے تو ضروری ہے کہ اُس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ قسم کھانے والا دس مسکینوں کو اُس معیار کا کھانا کھلائے جو وہ عام طور پر اپنے اہل و عیال کو کھلاتا ہے یا اُنھیں پہننے کے کپڑے دے یا ایک غلام آزاد کرے۔ اِن میں سے کچھ بھی میسر نہ ہو تو اُسے تین دن کے روزے رکھنا ہوں گے۔

# اشاریہ

# اشخاص

# مقامات

## ف



## ق



## م



## ن



## ہ



## ی

# موضوعات

## ث

## ج

## ڈ

## ک

## م

المورد

ادارۂ علم و تحقیق